سلسلۂ اشاعت نمبر ۱۱۷۰

تحریفِ قرآن کی حقیقت

مصنف
آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

ناشر

مکتب فقہی وکلامی بَرِّ صغیر حضرت غفران مآبؒ، نورِ ہدایت فاؤنڈیشن
حسینیہ غفران مآبؒ، مولانا کلب حسین روڈ، چوک لکھنؤ 226003 (یوپی) ہندوستان
Maktab e Fiqhiy o Kalaamiy e Barr e Sagheer e Hazrat Ghufraan Ma'aab (a r),
Noor e Hidayat Foundation
Imaambada Ghufraan Ma'aab, Maulana Kalb e Husain Road Chowk
Lucknow-3 UP India
www.noorehidayatfoundation.org, naqeeblucknow.com
Mob: 8004956536, 7390026883, 7390026843

Tahreef e Qur'aan Ki Haqeeqat

By

Aayatullaahil Uzama Sayyidul Ulama
Sayyid Ali Naqi Naqavi ar

Editor : Sayyed Mustafa Husain Naqavi Aseef Jaisi

Sub-Editor : Bint e Zahera Naqavi Nadal Hindi

Maktab e Fiqhiy o Kalaamiy e Barr e Sagheer e
Hazrat Ghufraan Ma'aab (a r), Noor e Hidayat Foundation
Imaambada Ghufraan Ma'aab,
Maulana Kalb e Husain Road Chowk Lucknow-3 UP India
www.noorehidayatfoundation.org, naqeeblucknow.com
Mob: 8004956536, 7390026883, 7390026843

نام کتاب : تحریفِ قرآن کی حقیقت

مصنف : آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

ناشر : مکتبِ فقہی وکلامیؒ برؒ صغیرِ حضرت غفران مآبؒ

مدیر : سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی

نائب مدیر : بنت زہرا نقوی ندیؔ الہندی

تاریخ وسنہ اشاعت : ۲۴ر مئی ۲۰۲۲ء

امام باڑہ غفران مآبؒ، مولانا کلب حسین روڈ، چوک لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳ (یو پی) انڈیا

عرضِ نور

علم وادب کی دنیا میں 'ماہنامہ' کی اپنی ابلاغی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ 'جلد بازی کے ادب' صحافت میں ایک حد تک استقامت کا رنگ بھر کر اسے علمی وادبی متانت کا قابل توجہ بنا دیتا ہے اور 'کتابی' انداز کی پذیرائی اور یادگاری کے قریب تر کر دیتا ہے۔ کچھ یہی وجہ ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں علمی و سائنسی تحقیقی مجلوں میں ماہنامہ کا غلبہ قائم ہے۔ ایسے مجلے عموماً اختصاصی ہو گئے ہیں اور اپنے معیار و مقدار کے لحاظ سے بڑے معتبر و موقر ہو چکے ہیں۔

دینی وملی ماہنامہ جو بنیادی طور پر اختصاصی ہوتے ہیں، ان کی بھی اپنی روایت رہی ہے اور اپنا خاص مقام۔ اردو زبان میں برصغیر ہند میں ایسے ماہناموں کی تاریخ قدیم بھی ہے اور درخشاں بھی۔

ماہنامہ 'شعاعِ عمل' ایسے ماہناموں کی صف میں شامل ہونے والا نسبتاً تازہ اضافہ ہے۔ پھر بھی یہ اپنی اشاعت کی 'صدی' برسوں پہلے مکمل کر چکا ہے اور 'دوسرے عشرہ' کی تکمیل کی طرف اپنے استقلال کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس 'کم عمری' میں اپنے نمود اور بلوغ نظر کے جھنڈے گاڑ چکا ہے۔ ساتھ ہی کئی جہات سے اپنے امتیازات اور خصوصیات ثبت کر چکا ہے۔ 'شعاعِ عمل' میں ابتدا سے معیاری علمی وتحقیقی مشمولات کے ساتھ 'یادگاری' کا عنصر نمایاں رہا ہے۔ علم وقلم کی نوابغ روزگار ہستیوں کی یادگار زمانہ مضامین کے ساتھ اس کا ہر شمارہ یادگار اور قابل قدر رہا اور مقبول عوام وخواص بھی۔ اسی یادگاری کے عنصر کے پیش نظر اس کے مطبوعہ ومطبوع عام معیاری مضامین کو ایک ایک کر کے سرِدست نور ہدایت فاؤنڈیشن کی آن لائن ڈیجیٹل لائبریری سے سالکانِ راہ تحقیق کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔

زیر نظر پیشکش ماہنامہ ''شعاعِ عمل'' اردو کے شائع شدہ ایک سو باسٹھویں شمارہ کی قسط وار کتاب ہے جس کا موضوع ''تحریفِ قرآن کی حقیقت'' ہے اور جس کے مصنف آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ ہیں۔

امید ہے، ہمارے اہل ذوق ونظر قارئین کرام ہماری اس پیشکش کو بھی شرف قبولیت اور ہمیں اپنے مفید آرا سے نوازیں گے۔

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی

دبیر مؤسسۂ نور ہدایت، لکھنؤ

❁❁❁

تحریفِ قرآن کی حقیقت

آیۃ اللہ العظمیٰ مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ رب العالمین والصّلوٰۃ علی سید المرسلین وآلہ الطاہرین

موجودہ زمانہ میں اسلام پر مخالفین کے حملے ہو رہے ہیں اور وہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے عیسائی مشن جو دنیا کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور آریہ مشن جو خاص ہندوستان کے ہر بڑے اور چھوٹے مقام پر موجود ہیں ان کے کارخانہ سے روزانہ نئے نئے اعتراضات ڈھل کر نکلتے ہیں جن کا اگر جواب نہ دیا جائے تو کمزور اور بے ثبات عقیدہ کے اشخاص یقیناً ان کی زد پر آ کر اسلامی عقائد سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس ذات پر ایسے ایسے شرمناک الزامات کے دنیا کو باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے جو حق وصداقت کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔

موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ضرورت اس کی تھی کہ تمام مسلمان ہم آہنگ ہو کر مخالفین کے مقابلہ کے لئے ایک متحد محاذ جنگ پیش کرتے اور اپنے قوی اور ذرائع کو مجتمع حیثیت سے اسلامی مشترکہ اصول کی حمایت میں صرف کرتے ہوئے دشمنان اسلام کے حملوں کا دفعیہ کرتے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض افراد جو خود مسلمانوں کے اندر افتراق واختلاف کی خلیج کو وسیع کرنا اپنے لئے بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں ہر روز ایسے ایسے مسائل معرض بحث میں لانا ضروری سمجھتے ہیں جن سے خواہ مخواہ اسلامی شیرازہ منتشر اور اتحاد اسلامی کی دیوار میں رخنہ پیدا ہو۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام کے لئے کچھ اصول اساسی ہیں کہ انہی کے اعتقاد کا مجموعہ اسلام کہا جاتا ہے اور ان میں تمام فرق اسلامیہ باوجود اپنے آپس کے اختلافات کے برابر سے شریک ہیں۔

الوہیت، رسالت، کتاب منزّل یعنی قرآن مجید اور روز قیامت یعنی معاد، فرق اسلامیہ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں وہ اسی معنی سے ہیں کہ مذکورۂ بالا اشیاء پر وہ ایمان لائے ہوئے ہیں اور اس کے بعد کسی جماعت کو دوسری جماعت کے مقابلہ میں یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے ایمان کا ان میں سے کسی شئے کے متعلق

انکار کرے۔

اور پھر جبکہ ایمان و اعتقاد امر باطنی ہے جس کے ادراک تک حواس ظاہریہ کا دسترس نہیں اور انکار کرنے والا عالم الضمائر والخفیات (رازہائے قلبی اور اسرار نہانی پر مطلع) نہیں ہے اور ایمان رکھنے والا اعلان کے ساتھ اپنے ایمان کا اظہار کر رہا ہے اور اس کے افعال و اعمال بھی اس کے عقیدہ کے ترجمان ہیں۔

اس کے بعد یہ افتراق انگیزی اور اختلاف ریزی نہیں تو کیا ہے کہ کسی جماعت پر اس کے اعلان و اظہار کے برخلاف یہ الزام عائد کیا جائے کہ تم قرآن پر ایمان نہیں رکھتے۔ جس کا قدرتی جواب اس جماعت کی طرف سے یہ ہے کہ تم خود ایمان نہیں رکھتے۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ آپس کی لڑائی غیروں کی ہنسائی، فریق ثالث یعنی ایک آریہ یا عیسائی کو یہ رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہو گیا کہ ان میں سے کسی کا بھی ایمان قرآن پر مسلم حیثیت نہیں رکھتا اور اس طرح خود قرآن کے مسلمہ وقعت و اعتبار میں شبہ پیدا کرنے کا موقع نکل آیا۔

کیا اسلام کی دوستی اور اس سے ہمدردی کا تقاضا یہی ہے؟ ہرگز نہیں اگر اسلام سے سچی محبت ہو تو لازم یہ ہے کہ اس قسم کے سوالات کو اٹھا کر افتراق کا مظاہرہ نہ ہونے دو۔ بلکہ تمام فرق اسلامیہ کے اس متفقہ عقیدہ کو کہ قرآن مجید وحی سماوی اور کتاب ربّانی منزّل من اللہ رسولؐ کا اعجاز ہے اس میں کوئی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں اور نہ اس میں ذرّہ برابر باطل کا شائبہ ہے اور اس پر ایمان و اعتقاد کامل تمام مسلمانوں کے اسلام کا جز و اعظم ہے۔'' اسی متفقہ و متحدہ صورت پر باقی رہنے دو۔

میں نے نہ اس لئے قلم اٹھایا ہے کہ کسی کے ایمان بالقرآن کی نفی کروں اور نہ اس کو کوئی مفید خدمت اسلام کی سمجھتا ہوں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ مسئلہ تحریف قرآن پر جو اس قسم کے مباحث کا سنگ بنیاد ہے تاریخ و حدیث و درایت کی روشنی میں انتقادی نظر ڈالتے ہوئے فریقین کے مذہبی روایات اور تاریخی مندرجات کے رو سے قرآن مجید کے اعتبار و استناد پر ایک مکمل تبصرہ کروں۔

قرآن مجید کی عظمت

پیغمبر اسلام کی نبوت کا زندہ ثبوت

گذر گئے انبیائے سلف اور مردہ ہو گئیں ان کی نبوتیں اس لئے کہ ان کی بنیاد ایسے دلائل پر تھی جو وقتی

طور پر انصاف کی شرط سے منکرین کے سر تسلیم کو خم کرانے کے لئے کافی تھے لیکن ان میں دوام و استمرار کا جوہر نہ تھا۔ ان میں اتنا دم نہ تھا کہ وہ زمانہ کی سیلابی رفتار میں اپنے وجود کو محفوظ رکھ سکیں۔ وہ ایک خاص وقت اور جزو زمانہ کے پابند تھے جو اس وقت کے منقضی ہونے پر خود بھی رخصت ہو گئے اور اپنے بعد کے لئے صرف افسانہ کی صورت پر اپنا تذکرہ چھوڑ گئے جو دس بیس برس تک اگر مشاہدہ کرنے والی جماعت کی موجودگی کے باعث تواتر کی حیثیت رکھنے کی وجہ سے نا قابل انکار بھی تھا تو اس سے زیادہ زمانہ گذرنے کے بعد اور خصوصاً دوسری تیسری صدی میں تو وہ مشکوک اور مشتبہ حکایات کا مجموعہ ہو گیا جن میں ناقلین کی کتر بیونت اور بھول چوک کی وجہ سے پیدا شدہ اختلافات نے اور زیادہ کمزوری پیدا کر کے ان کو توہم پرستیوں کا کرشمہ سمجھنے کے کافی وجوہ پیدا کر دیئے۔

مسلمانوں کے لئے قرآن مجید میں اگر ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ وغیر دیگر انبیاء کی نبوت اور ان کے بعض معجزات کا تذکرہ نہ موجود ہوتا تو کبھی ان کو تسلیم کرنے کے وجوہ پائے نہ جاتے اور اسی لئے وہ اشخاص جو اپنی اپنی قوم میں بڑے مرتبوں پر فائز کہے جاتے ہیں جیسے زردشت اور گشتاسپ اور ہندوستان کے قدیم راہنما ان کی نبوت کبھی وہم واحتمال کے دائرہ سے نکل کر اعتقادی حدود میں داخل نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ان کی مقدسانہ زندگی کے متعلق جتنے بھی حیرت انگیز کرامات کی شہرت ان کی جماعت کے اندر ہو لیکن وہ کسی غیر جانبدار شخص کو جو اس جماعت سے تعلق نہ رکھتا ہو ان کی طرف جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ اس شہرت میں خوش عقیدگی اور سادہ لوحی اور توہم پرستی کا عنصر بہت حد تک کارفرما سمجھا جا سکتا ہے۔

کرین نیاز فتحپوری معجزات عیسیٰ کا انکار، ہم ان کے دعوائے اسلام کی بناء پر یہ کہہ کر تو چپ کر دیں گے کہ تم مسلمان ہو اور قرآن مجید میں ان معجزات کا تذکرہ موجود ہے۔ لہٰذا تمہیں انکار کا حق نہیں چنانچہ چھ برس پہلے میں نے ایک مبسوط مقالہ ''اعجاز عیسوی'' کے عنوان سے ''نگار'' کے مذکورہ بالا خیالات ہی کی رد میں قلمبند کیا تھا جو الواعظ کی متعدد اشاعتوں میں مسلسل طور پر شایع ہوا لیکن اس مضمون میں جہاں تک دیکھا جائے یہی ہے کہ قرآنی ادلہ سے صاف طور پر ان معجزات کا ثبوت پیش کر کے مدیر ''نگار'' نے اس کے خود ساختہ تاویلات کر کے جو دھاندلی کرنا چاہی ہے اس کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ وہ مضمون مسکت ضرور ہے اور اسی بناء پر ''نگار'' کو پھر اس پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی لیکن یہ اسی وقت تک کہ جب تک بدقسمتی سے مدیر نگار اپنے تئیں مسلمان کہے

جاتے ہیں اور اگر وہ ذرا جرأت کر کے یہ کہہ دیں کہ میں قرآن کی آیتوں کو نہیں مانتا تو پھر ان کی فتح اور ہماری شکست، ہم پھر معجزات عیسیٰ کا کوئی ثبوت ان کے سامنے پیش نہیں کر سکتے اس لئے کہ حربہ ہمارے ہاتھ میں ایک ہی تھا جس کو انھوں نے ہم سے چھین لیا یہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی خصوصیت ہے کہ حضرت کی نبوت دنیا کے آخری دور تک ہر وقت زندہ ہے، حضرت کی نبوت و رسالت کی بنیاد صرف ان وقتی معجزات پر نہ تھی جو اس زمانہ میں موجود ہونے والے اشخاص ہی کے سر تسلیم کو خم کرا سکتے بلکہ حضرت کے دعوے کی بنیاد اس قرآن مجید پر ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس گذرنے کے بعد بھی اس وقت زندہ ہے اور دنیا کو حق و صداقت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔

قرآن مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے

دنیا تہی دست ہے جبکہ اس کے پاس قرآن کے مثل کوئی کتاب نہیں لیکن مسلمان قرآن کی بدولت اس خزانۂ عامرہ کے مالک ہیں جس کی نظیر صفحہ روزگار میں مل نہیں سکتی۔

تباہ ہو جائیں سابقہ اسلامی سلطنتیں اور مٹ جائے ان کا جاہ و جلال لیکن جب تک مسلمانوں کے ہاتھوں میں قرآن موجود ہے وہ دنیا کے اقوام میں سربلندی کے مالک ہیں، حقانیت و صداقت کا علم ان کے سر پر لہراتا اور غیبی طاقت و جبروت کا پرچم ان کے ساتھ ہوا میں اڑ رہا ہے۔

قرآن جس طرح اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے مشرکین عرب کے لئے معجزہ تھا جو اس قلمرو میں خداوندی کے مدعی تھے اسی طرح وہ اپنے حقائق و اسرار کی حیثیت سے بھی معجزہ ہے۔

اس کی آیتوں میں وہ بیش بہا جوہر نظر آتے ہیں جو بڑے سے بڑے فلسفی کو اپنی حقانیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس میں علوم و فنون کے وہ اسرار و دقائق مندرج ملتے ہیں جن کو سالہا سال کی تحقیقات کے بعد معلوم کرنا سرمایۂ افتخار سمجھا گیا ہے۔

اس میں ایسے اکتشافات کا بھی پتہ ہے جن سے دنیا قرآن مجید نازل ہونے کے تیرہ سو برس بعد تک بھی بے خبر رہی اور اب تحقیق و جستجو کے ہاتھوں نے پردہ ہٹا کر ان حقائق کو سامنے پیش کر دیا ہے۔

پیش کریں مسلمان اور شوق سے پیش کریں اس قرآن کو تمام مذاہب عالم کے سامنے بلند کریں آواز اور اس طرح کہ دنیا کی وسیع فضا گونج اٹھے اور پھر دعوت دیں کہ تمام فلاسفۂ دنیا، تمام علوم و فنون کے ماہر، تمام

تمدن واخلاق وعلم النفس وسیاست واجتماع اور مذاہب وادیان کے راہنما اس کی ایک ایک سطر ایک ایک جملہ بلکہ ایک ایک حرف کو دیکھیں درس لیں پڑھیں اور اس میں غور کریں یقیناً غلط فریبی کے پردے جو آنکھوں پر پڑے ہیں اٹھ جائیں گے، قرآن کی حقانیت آفتاب نیمروز بن کر چمکے گی اور دنیا کو اپنا حلقہ بگوش بنا لے گی۔ یہ ہے قرآن کہ جو مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ اور اسلام کا خزانۂ عامرہ ہے۔

وحی آسمانی کی طرف منسوب شدہ کتابوں پر نظر

وہ کتابیں جو الہامی سمجھی جاتی ہیں اور وحی آسمانی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ان کے متعلق اگر خود ان کے ماننے والوں کے محررات کی روشنی میں نظر کی جائے تو ان کی تاریخ زندگی ایسے حوادث وانقلابات کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ جن کی بناء پر کسی صورت سے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے کسی حصہ، کسی جزو کا وجود بھی دنیا میں باقی ہے اور یہ کہ جسے اب اس کے متبعین سر اور آنکھوں پر رکھ رہے ہیں اور خدا کا کلام سمجھتے ہیں اس میں کوئی آدھا چوتھائی جملہ بھی اس حقیقی وحی سے عیناً مطابق ہے جو پیغمبروں پر نازل ہوئی تھی۔

توریت کی سرگذشت

توریت کہ جو یہود ونصاریٰ کی متفقہ کتاب اور اس لحاظ سے مخصوص اہمیت کی مالک ہے اس کی تاریخ عجب روح فرسا مصائب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر ایک اس کی زندگی کو فنا کر دینے کی ضامن ہے۔

پہلی مصیبت

اس کے امانت دار اور حامل (بنی اسرائیل) کا بار بار دیانت موسویہ سے کنارہ کشی کر کے ارتداد اختیار کرنا اور تمام قوم کا من حیث المجموع بیک مرتبہ خدا پرستی کو ترک کر کے بت پرستی شروع کر دینا جس کے نمونہ دو چار نہیں بلکہ دو تین صدی کے اندر دس بیس کی تعداد یا اس سے زیادہ تک پہونچتے ہیں۔

بھلا وہ قوم کہ جو خود موسیٰ کی زندگی میں حقائق الٰہیہ سے اتنی بعید تھی کہ بات بات پر توحید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر شرک اختیار کرتی تھی وہ موسیٰ کے بعد کب دیانت موسویہ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر شرک اختیار کرتی تھی وہ موسیٰ کے بعد کب دیانت موسویہ پر قائم رہ سکتی تھی۔ چنانچہ ابھی موسیٰ کے وصی یوشع کے انتقال کو کچھ زیادہ عرصہ گذرنے نہ پایا تھا کہ بنی اسرائیل نے اپنے خدائے برحق کو چھوڑ کر دوسرے خداؤں کی پرستش شروع کر دی اور ان کو سجدہ کرنے لگے جس کی سزا میں خدا نے ایسے اقوام کو مسلط کیا جنھوں نے ان کو غارت اور

ان کے اموال کو برباد کیا اور ان کو غلام و کنیز بنا کر فروخت کیا، اس کے بعد وقتاً فوقتاً خدا مصلح پیدا کرتا رہتا تھا لیکن ادھر ایک مصلح کا انتقال ہوتا تھا ادھر پوری قوم کی قوم کفر و شرک اختیار کر لیتی تھی۔

(سفر قضاۃ، باب ۲ آیت ۱۱۔۱۹)

بنی اسرائیل کا قیام کنعانیین و حشیین و اموریین وغیرہ کے درمیان ہوا اور ان سے میل جول بڑھا یہاں تک کہ ان کی لڑکیوں کی شادی ان کے یہاں اور ان کی لڑکیوں کی شادی ان کے یہاں ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے خداؤں کی پرستش کرنے لگے۔ اور اپنے خدا کو بالکل بھول کر بتوں کا پوجا پاٹ کرنے لگے جس کی پاداش میں خدا نے پوری قوم کو کوشاں رشعتایم بادشاہ آرام النہرین کی غلامی میں دے دیا۔

(باب ۳، آیت، ۵-۸)

گذشتہ پاداش سے عاجز آ کر توبہ وانابت کی اور خدا نے ان کو اس غلامی سے نجات دی لیکن چالیس ہی برس گذرے تھے کہ پھر پوری قوم دین سے پلٹ گئی جس کی سزا میں خدا نے عجلون بادشاہ مواب کو مسلط کیا اور ۱۸ برس تک تمام بنی اسرائیل کو اس کی غلامی کرنا پڑی۔

(آیت، ۱۲-۱۴)

اس کے بعد خدا نے رحم کھا کر نجات دی مگر اسی برس کے بعد پھر بنی اسرائیل نے شرارت شروع کر دی اور خدا نے یابین بادشاہ کنعان کو مسلط کیا جس نے بنی اسرائیل کو بیس ۲۰ برس تک سخت ترین تکلیفیں پہونچائیں۔

(باب ۴، آیت ۱-۴)

پھر چالیس برس صبر و سکون میں گذرے اور اس کے بعد پانچویں مرتبہ بنی اسرائیل نے شرک اختیار کیا اور بت پرستی شروع کی جس کی سزا میں سات برس یدمدیان کی غلامی کرنا پڑی۔

(باب ۱۶، آیت، ۱)

چھٹی مرتبہ جدعون کے انتقال کے بعد بنی اسرائیل پھر موسوی دیانت سے پلٹ گئے اور بتوں کی پرستش کرنے لگے اور اس خدا کو بالکل بھول گئے جس نے ان کو چند مرتبہ ظالمین سے نجات دی تھی۔

(باب، ۸، آیت، ۳۳، ۳۴)

ساتویں دفعہ اس وقت جب یائر جلعادی قاضی کا انتقال ہوا تھا بنی اسرائیل نے شرک اختیار کیا اور کثیر التعداد بتوں کی پرستش شروع کردی اور خدا کی عبادت کو ترک کر دیا جس کی وجہ سے خدا نے ان کو فلسطینیوں کے ہاتھ بیچا اور انھوں نے اٹھارہ برس اتنی سختی سے حکومت کی کہ بنی اسرائیل کی ہڈیوں پسلیوں کو چورا کر دیا۔

(باب ۱۰، آیت ۶-۸)

پھر عبدون بن ہلیل فترتو کی وفات کے بعد ان لوگوں نے اسی قسم کے افعال کا اعادہ کیا جس پر دوبارہ ان فلسطینیوں کو چالیس برس تک کے لئے مسلط کیا گیا۔

(باب ۱۳، آیت ۱۔)

مختصر یہ ہے کہ موسوی لوگ موسیٰ کی تعلیم کے خلاف دوسرے اقوام سے میل جول بڑھا کر ان کے اخلاق وعادات سے متاثر ہوتے اور ان کے بتوں کی پرستش کر کے شرک کو اختیار کرتے تھے اور اپنے لڑکوں لڑکیوں کو بتوں کی خاطر قربانی کرتے تھے جس کی بنا پر متعدد بار خدا کا غضب ان پر نازل ہوا اور ہر مرتبہ ان پر ظالمین کو مسلط کیا جاتا تھا جو ان کی انتہائی توہین وتذلیل کرتے تھے اور پھر ہر مرتبہ خدا نے توبہ وانابت کے بعد ان کو نجات دی لیکن وہ لوگ متفقہ طور سے اس کی نافرمانی ہی کرتے رہے۔

(مزمور، ۱۰۶، آیت، ۳۴-۴۳)

جب سلیمان کا انتقال ہوا اور مملکت بنی اسرائیل دو حصوں میں منقسم ہوگئی ایک جماعت نے جو یہودا وبنیامین کی نسل سے تھی رحبعام کو منتخب کیا اور باقی جتنے اسباط کی اولاد تھی انھوں نے یربعام کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا، یربعام نے ان کے لئے دو گوسالہ سونے کے تیار کرائے اور اعلان کیا کہ خدا یہی ہیں جن کی پرستش کرنا لازم ہے چنانچہ ان کی پرستش جاری ہوگئی اور ان کے اطراف وجوانب میں کاہنین نے ڈیرے ڈال دیئے اور ایک طویل عرصہ تک ان کی پرستش جاری رہی۔

(سفر ملوک اول، باب ۱۲، آیت، ۲۵-۳۳)

حد یہ تھی کہ اخاب کے زمانہ میں صنم کی طرف دعوت دینے والے چار سو پچاس نبی تھے اور مختلف ستونوں کے جن کی پرستش ہوتی تھی چار سو نبی تھے۔

(ملوک اول، باب ۱۸، آیت ۱۹)

یہ حالت ان لوگوں کی ہوشع بن ایلہ کے عہد سلطنت تک قائم رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ہر سر بلند ٹیلے کے اوپر اور سر سبز درخت کے نیچے اصنام نصب کئے اور ان کی نذر کے لئے آگ روشن کی خدا کے تمام فرائض وحدود کو ترک کر دیا اور باطل کی پرستش کی اور اپنے لئے طلائی گوسالے ڈھلوا کر بنوائے جن کی عبادت کرتے تھے جس کی پاداش میں غضبناک ہوکر رب نے ان کی تمام قوم کو ذلیل کر دیا اور اشوریین کے حوالہ کیا جنھوں نے ان کو لوٹا اور برباد کیا۔

(ملوک دوم، باب ۱۷، آیت ۷-۱۰)

عثلیا نبت عمری کی اولاد کے زمانۂ سلطنت میں بیت المقدس کو منہدم کر دیا گیا اور تمام معابد الٰہیہ صنم پرستی کے لئے وقف ہو گئے۔

(اخبار ایام ثانی، باب ۲۴، آیت ۷۔)

یہود یاداع کے انتقال کے بعد تمام رؤسا ملک یواش کے پاس آئے اور اس کو سجدہ کیا اور خدا کی عبادت کو ترک کر کے بت پرستی اختیار کر لی۔

(باب ۲۴، آیت ۱۷، ۱۸)

امصیا نے بادشاہ ہوکر بنی ساعیر کے بت لا کر ان کے درمیان رکھے اور ان کو سجدہ کیا اور ان کے لئے آگ روشن کی۔

(باب ۲۵، آیت ۱۴، ۱۵)

احاز کی سلطنت ہونے پر پھر مورتیں تراشی گئیں جن کی عبادت ہوتی تھی اور اولادیں قربانی کے لئے جلائی گئیں اور بلندیوں کے اوپر اور شاداب درختوں کے نیچے پرستش کے لئے بت نصب کئے گئے جس کی پاداش میں ملک آرام کے ہاتھوں ان میں کے ایک لاکھ بیس ہزار آدمی قتل ہوئے اور لاکھوں آدمی قید کئے گئے۔

(باب ۲۸، آیت، ۲-۶)

ان لوگوں نے بیت المقدس کے دروازوں کو بند اور اس کے چراغوں کو خاموش کر دیا اور خدائے برحق کی عبادت ترک کر دی۔

(باب ۲۹، آیت ۷)

بیت المقدس میں اتنی نجاست جمع ہوگئی تھی کہ حزقیال نے جب اس کی تطہیر کا ارادہ کیا تو آٹھ دن میں وہ نجاستیں ہٹائی گئیں۔

(باب ۲۹، آیت، ۱۶-۱۹)

حزقیال کے بعد اس کے بیٹے منسی نے پھر کفروشرک کی بنیادیں قائم کیں اور وہ تمام اصنام جو اس کے باپ نے منہدم کئے تھے از سرنو قائم کر دیئے اور تمام یہودیوں کو گمراہ کر کے ایسے افعال کرائے جو گذشتہ نسلوں کے افعال سے بھی زیادہ قبیح تھے۔

(باب ۳۳، آیت، ۱-۱۰)

بھلا ایک ایسی قوم جس نے مذہبی حیثیت سے اتنے پلٹے کھائے ہوں اور اتنی مرتبہ ارتداد کو اختیار کر کے کفروشرک اور بت پرستی کے راستہ پر لگی ہو اس کے متعلق کہاں یہ اطمینان ہوسکتا ہے کہ اس نے کتاب الٰہی اور توریت حقیقی کو اس کی اصلی حالت پر رہنے دیا ہوگا۔ یا اس کی حفاظت میں کوئی اہتمام کیا ہوگا بلکہ اس کی کفر پروری اور باطل پرستی کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اس میں اپنی خواہش کے مطابق طرح طرح کے تصرفات کر کے اس کو اپنے مذاق کے موافق بنالے اور پھر جبکہ ہم کو موجودہ توریت کے اندر جا بجا شرک وتعدّد الٰہہ کے عقیدہ کی جھلک بھی نظر آرہی ہے جس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ توریت عبرانی میں اکثر مقامات پر خدا کا تذکرہ کرنے کے موقع پر لفظ ''الوھیم'' کا اطلاق ہوا ہے اور عبرانی میں ''م'' علامت جمع ہے جس کے بنا پر معنی اس کے ہوئے ''خدایان'' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مذہبی افتادطبیعت کا اثر توریت کے اوپر پڑے بغیر نہیں رہا اور ان کے شرک وصنم پرستی کے مسلسل ومتواتر تظاہرات نے توریت کے اندر بھی رنگ آمیزیاں کی ہیں۔

دوسری مصیبت

توریت کا اصلی نسخہ جو موسیٰ نے خود لکھ کر اولاد لاوی کے سپرد کیا تھا اس کے متعلق ہدایت یہ تھی کہ وہ تابوت عہد رب کے پہلو میں بیت المقدس کے اندر رکھا جائے۔

(سفر تثنیہ باب ۳۱، آیت ۲۵، ۲۶)

لیکن اس کے بعد تابوت عہد رب میں جو انقلابات ہوئے ان میں اس نسخہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا، وہ وقت کہ جب فلسطینیوں نے بنی اسرائیل پر غلبہ حاصل کیا اور بنی اسرائیل نے اپنی انتہائی شکست کے خوف

سے تابوت کو بیت المقدس سے نکال کر محلہ عبرانیین میں منتقل کیا اور فلسطینیوں کو اس کی اطلاع ہو گئی جس کی بناء پر ایک مرتبہ انھوں نے ہلّہ کر دیا اور اسرائیلیین نے تابوت کو چھوڑ کر فرار کیا اور اہلِ فلسطین نے تابوت پر قبضہ کر لیا اس وقت اس نسخہ کا کوئی تذکرہ نہیں۔

(صموئیل اول باب، ۴)

پھر جب داوٗد نے اس تابوت کو بیت عوبید میں منتقل کیا اور تین مہینہ وہاں رکھنے کے بعد اپنے شہر صیہون میں لے گئے وہاں بھی اس نسخہ کا کوئی ذکر نہیں۔

(صموئیل دوم باب ۶)

پھر جب سلیمان نے تابوت رب کو خیمۂ اجتماع اور تمام مقدس ظروف کے ساتھ جو اس خیمہ میں تھے صیہون سے بیت المقدس کی محراب میں منتقل کیا تب بھی اس نسخہ کا نام ونشان نہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نسخہ تابوت کے اندر تھا اس لئے کہ اس موقع پر تابوت کے اندر بتصریح عہد قدیم صرف وہ دو پتھر کی لوحیں تھیں جو مصر سے نکلتے وقت انھوں نے بطور معاہدہ بنی اسرائیل کے لئے مقام حوریب میں تابوت کے اندر رکھی تھیں۔

(ملوک اول باب ۸، آیت ۱-۱۰)

اگر یہ امر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ نسخہ تابوت کے پاس بیت المقدس کی محراب کے اندر موجود تھا تو کیا وہ اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب رحبعام کے زمانہ میں شوشق بادشاہ مصر نے اورشلیم پر چڑھائی کر کے خانۂ خدا کے تمام خزانے اور بیت المقدس کی (بلا استثناء) ہر چیز لوٹ کر اپنے قبضہ میں کر لی تھی۔

(ملوک اول باب ۱۴، آیت ۲۵، ۲۶)

اگر وہ اس وقت باقی بھی رہ گیا ہو تو کیا وہ اس وقت رہ سکتا ہے۔ جب عثلیا کی اولاد نے بیت المقدس کو منہدم کر دیا تھا اور جتنی مقدس چیزیں اس میں تھیں وہ اپنے بت بعلیم کے لئے لے گئے تھے جس کے بعد یواش اور یہودیا کو دوبارہ بیت المقدس کی از سرنو اس کی سابقہ بنیادوں پر تعمیر کی ضرورت ہوئی تھی۔

(ایام دوم باب ۲۴، آیت ۷-۱۳)

فرض کرو کہ اس وقت بھی وہ نسخہ باقی رہا تو کیا اس وقت بھی وہ باقی رہا جب یہواش مشرک نے اورشلیم

میں آکر اس کی چار دیواری کو چار سو ہاتھ کی مسافت تک منہدم کردیا اور جتنا طلا ونقرہ اور جتنے ظروف بیت المقدس میں موجود تھے سب کو قبضہ میں کرلیا۔

(ملوک دوم باب ۱۴، آیت ۱۳، ۱۴)

اچھا اس وقت وہ باقی رہا تو کیا اس وقت وہ تلف نہیں ہوا جب احاز مشرک نے تمام بیت المقدس کی اشیاء کو ضبط کرکے بیت المقدس کے دروازوں میں قفل لگادیئے اور شیلم کے ہر گوشہ میں اپنے لئے مذابح یعنی قربانی کے مقامات مقرر کئے۔

(ایام ثانی باب ۲۸، آیت ۲۴)

اور کیا اس جماعت نے اس نسخہ کو چھوڑ دیا تھا کہ جس نے بیت المقدس کو نجاست سے اس طرح مملو کردیا تھا کہ آٹھ دن اس کی صفائی میں صرف ہوئے۔

(باب ۲۹، آیت ۱۷)

درایت کے اصول پر ان واقعات کو دیکھنے سے یہ یقین پیدا ہوجاتا ہے کہ توریت کا اصلی نسخہ باقی نہ تھا اور وہ انقلابات وحوادث کی نذر ہوگیا تھا۔

تیسری مصیبت

توریت کے اصلی نسخہ کے سوا کسی دوسرے نسخہ کا وجود بھی صدر اول میں پایا نہیں جاتا اور اگر پایا بھی جائے تو وہ صرف دو ایک شخصوں کے پاس محدود تھا اور عام طور سے اس کے نسخوں کی اشاعت نہ ہوئی تھی اور اس لحاظ سے اگر اصلی نسخہ مفقود ہوجاتا تو اس کا قائم مقام ملنا ممکن نہ تھا اور اس پر کوئی افتاد پڑتی خواہ اس کو مفقود کرکے دوسرا اس کی جگہ پر ایجاد کرلیا جاتا یا خود اسی میں کمی زیادتی کرکے تراش خراش کی جاتی تو اس کی عام طور پر شناخت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

عہد مقدس میں تصریح موجود ہے کہ بنی اسرائیل پر بہت ایسے وقت گذرے ہیں کہ نہ ان کے لئے کوئی سچا خدا تھا اور نہ کوئی تعلیم دینے والا کاہن جس کے تعلیمات پر وہ چلتے اور نہ ان کے لئے کوئی شریعت موجود تھی۔

(ایام دوم باب ۱۵، آیت ۳)

اور عبرانی نسخہ میں یہ ہے کہ نہ ان کے پاس اس زمانہ میں تورات تھی۔

وہ وقت کہ جب یوشیا نے شاقان کاتب کو بیت المقدس میں وہاں کے کاہن حلقیا کے پاس بیت المقدس کے بعض داخلی انتظامات کے لئے بھیجا ہے اس موقع پر حلقیا نے کہا کہ مجھے بیت المقدس میں سفر الشریعۃ (توریت) دستیاب ہوا ہے اور وہ سفر شاقان نے لاکر بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اس کو پڑھ کر سنایا، بادشاہ نے اس کو سن کر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور کاہنوں کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ بارگاہ خدا میں توبہ و انابت کریں ان مضامین کی جہت سے جو اس دستیاب ہونے والے سفر میں ہیں اس لئے کہ ہم نے اور ہمارے آباؤ اجداد نے اب تک ان تعلیمات پر عمل نہیں کیا۔

(ملوک دوم باب ۲۲، آیت ۸ - ۱۳)

نیز بادشاہ نے تمام بزرگان یہودا اور شلیم کو جمع کیا اور بادشاہ ان سب کو لے کر بیت المقدس کی جانب گیا اور ان سب کو وہ سفر پڑھ کر سنایا اور خدا کے ساتھ عہد و پیمان لیا کہ اب وہ اس کے احکام پر عمل کریں گے اور بادشاہ نے کاہنوں کو حکم دیا کہ وہ بیت المقدس سے تمام ان اسباب و آلات کو جو صنم پرستی کے لئے وہاں جمع کئے گئے تھے نکال کر اور شلیم کے باہر آگ میں جلادیں اور اس طرح جتنے فسق و فجور اور کفر و شرک کے ذرائع بیت المقدس کے اندر اور ارد گرد تھے سب کو تباہ و برباد کردیا۔

(باب ۲۳)

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے قبل سفر تورات موسائیوں کے ہاتھ میں موجود نہ تھا اور وہ مفقود ہو چکا تھا جب ہی حلقیا کے ذریعہ سے بادشاہ نے جو تورات کے مضامین کو سنا تو وہ از خود رفتہ ہو گیا اور وہ اس کو عجب چیز معلوم ہوئے اور ان تعلیمات کو سن کر جواب تک ان کے گوش زدنہ ہوئے ان تمام لوگوں پر خوف و ہراس کا غلبہ ہوا۔

پھر جبکہ تورات کا نسخہ اس کے پاس موجود نہ تھا تو اس بات کی کونسی ضمانت ہوسکتی ہے کہ حلقیا نے جو کتاب تورات کہہ کر دی وہ حقیقۃً توریت ہی تھی؟

کیا نہیں ممکن کہ بادشاہ کو صحیح راستہ پر لگانے کے لئے یہ حلقیا کی ایک چالاکی ہو جو برموقع نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

پھراس موقع پر کہ جب سبی بابل سے یہ لوگ نجات پا کرواپس ہوئے اور خدا پرستی کی طرف توجہ کی تو تمام جماعت نے متفقہ حیثیت سے عزرا کاتب کے پاس آ کر مطالبہ کیا کہ وہ سفرتوریت کو لاکران کے سامنے پڑھ کرسنائے چنانچہ عزرااس سفرکو لے کرتمام جماعت کے سامنے جومزدوروں سے مخلوط تھی لے کرآیا اور صبح سے دوپہر تک اس کو پڑھ کرسناتا رہا، تمام مجمع گوش برآواز تھا اور توریت کے مضامین کوسن کران کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ دوسرے دن تمام بڑے بڑے پادری اور کاہن اور لاویین عزرا کے پاس جمع ہوئے کہ وہ ان کو آیات توریت کے معنی سمجھائے چنانچہ اس میں لکھا ہوا پایا کہ بنی اسرائیل ساتویں مہینہ میں عید کے دن چھتوں کے نیچے بسر کریں جس کوسن کرسب چھتوں کے بنانے میں مشغول ہو گئے۔

(سفرنحمیا باب ۸)

توریت میں یہ بھی لکھا دیکھا کہ عمونیا اور موبیا کبھی موسائیوں کی جماعت میں داخل نہ ہونے پائیں اس لئے کہ انھوں نے بنی اسرائیل کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کی۔ یہ سن کران لوگوں نے مذکورۂ بالا اشخاص کو جماعت سے جدا کردیا۔

(نحمیا باب ۱۳)

اس سے بھی غیر مشتبہ طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ توریت کا وجود صرف عزرا سے مخصوص تھا یہاں تک کہ آباء یسوعیین اور کاہن لوگ جو حقیقۃً توریت کے امانتدار تھے ان کے پاس بھی اس کا وجود نہ تھا ورنہ ان سب کو باتفاق عزرا کے پاس جمع ہوکرتوریت کے سننے اور سمجھنے کی ضرورت نہ تھی اور نہ اس توریت سے ایسے احکام پر وہ مطلع ہوتے جن سے اب تک وہ بالکل بے خبر تھے اور اب توریت کے سننے کے بعد ان کو توجہ پیدا ہوئی۔

جب توریت کا وجود اتنی محدود حیثیت رکھتا تھا کہ وہ ہر وقت صرف ایک شخص کے پاس محفوظ تھا تو اب توریت کا اصلی حالت پر باقی رہنا صرف اسی شخص کے رحم وکرم کا پابند ہے ورنہ اگر کہیں پر شخصی ونفسانی اغراض نے قلم کو جنبش دیدی تو اس کی نہ داد ہوسکتی ہے نہ فریاد اس لئے کہ سوائے اس کے کوئی شخص تورات پر مطلع ہی نہیں ہے۔

مثال کے طور پر کیا یہی نہیں ممکن کہ عمونیا وموابیا کی جماعت سے نکال دیئے جانے کا حکم جو توریت

میں تازگی کے ساتھ پایا گیا اور موسائیوں کو خواہ مخواہ اس پر عمل کرنا پڑا وہ کسی ذاتی کاوش کا نتیجہ تھا کہ جو عزرا کو ان اشخاص سے پیدا ہوگئی تھی۔

یقیناً جبکہ تورات ایک یا دو شخصوں کا مخصوص سرمایہ قرار پا گئی تو اب نہ اس میں تواتر کا دعویٰ ہوسکتا ہے اس لئے کہ تواتر کے لئے اتنی جماعت کی ضرورت ہے۔ جن کا خلاف واقعہ بات کے بیان کرنے پر متفق ہو جانا ناممکن ہو اور نہ اس کے کسی قسم کی تحریف وتبدیل کے خلاف کوئی ضمانت ہوسکتی ہے۔

چوتھی مصیبت

خود کتاب مقدس میں متعدد جگہ اس کے تصریحات پائے جاتے ہیں کہ توریت میں تحریف ہوئی ہے اور وہ اپنی حالت پر باقی نہیں ہے۔

(ملاحظہ ہو سفر ارمیا باب ۲۳، آیت ۳۶)

''وحی الٰہی کا تو نام ہی نہ لو اس لئے کہ وحی ہر شخص کی وہی ہے جو اس کا کلام ہو اور تم نے خدا کے کلام میں تحریف کر دی ہے۔''

(نیز باب ۸، آیت ۸)

''کس طرح تم کہتے ہو کہ ہم حکماء ہیں اور شریعت خدا (توریت) ہمارے پاس ہے۔ یقیناً یہ غلط ہے۔ اس شریعت کو تو لکھنے والوں کے دروغ گو قلم نے بدل دیا ہے۔''

سفر اشعیا باب ۲۹، آیت ۱۶ میں ہے۔

''اف رے تمہاری تحریف''

افسوس ہے کہ ان تصریحات میں تحریف کی نوعیت کو بھی بتلا نہیں دیا گیا ہے جس کی بناء پر ہر قسم کی تحریف کا شبہہ ہوسکتا ہے اور پھر سفر ارمیا والی پہلی آیت سے تو صاف ظاہر ہے کہ تحریف اس حد پر ہوئی جس نے اس کو درجۂ اعتبار سے ساقط کر دیا جب ہی کہا جاتا ہے کہ ''وحی آسمانی کا نام لو۔''

اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریف احکام الٰہیہ کو بھی صدمہ پہونچائے بغیر نہیں رہی جب ہی یہ کہنے سے منع کیا گیا ہے کہ شریعت خدا ہمارے پاس موجود ہے۔

ان تمام مصائب کے بعد جنھوں نے کتاب مقدس کی زندگی کو مشکوک بنا دیا۔ یہ کسی صورت پر باور

نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ توریت یا اس کا کوئی ایک جزو بھی بالکل وہی ہے جو موسیٰ پر نازل ہوئی تھی بلکہ پوری کتاب کے متعلق یہ شبہہ پیدا ہونے کا حق ہے کہ وہ کسی جدّت طرازی اور طبع آزمائی کا نتیجہ ہے جس طرح اس کے ہر ہر جزو کے متعلق یہ خیال کئے جانے کا موقع ہے کہ وہ کسی کی تراش وخراش کا نتیجہ ہو۔ اوراس کے بعد کسی ایک لفظ کے متعلق بھی بوثوق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ یقیناوحی آسمانی کے مطابق اور خدا کا کلام ہے۔

اور پھر لطف یہ ہے کہ خوداس میں ایسے شواہد موجود ہیں جو بتلارہے ہیں کہ وہ پورے کا پورا خدا کا کلام نہیں ہے جو موسیٰ پر نازل ہوا تھا یہاں تک کہ سفر تثنیہ کے باب ۳۴ میں موسیٰ کی وفات کا قصّہ اور بنی اسرائیل کی ان پر گریہ وزاری تک کا تذکرہ موجود ہے چنانچہ اس میں لکھا ہے۔

موسیٰ زمین مواب میں انتقال کر گئے اور وہیں دفن ہوئے اور آج تک کسی کو ان کی قبر کا پتہ نہیں چلا اور موسیٰ کی عمر اس وقت ایک سو بیس برس کی تھی باوجود اس کے ان کے آنکھوں کی بصارت اور ان کے چہرہ کی شادابی میں فرق نہ آیا تھا۔ بنی اسرائیل تیس دن تک موسیٰ پر گریہ وزاری کرتے رہے اور یوشع بن نون روح حکمت سے پر تھے اس لئے کہ موسیٰ نے اپنا ہاتھ ان پر رکھا تھا، بنی اسرائیل نے ان کی اطاعت کی اور ان احکام پر عمل کیا جو رب نے موسیٰ کو دیئے تھے، موسیٰ کے بعد پھر کوئی ویسا بنی اسرائیل کو نصیب نہیں ہوا جس سے خدا منھ درمنھ شناسائی پیدا کرے۔‘‘

یہ لفظیں ہرگز اس تورات کی نہیں ہوسکتیں۔ جو خدا نے موسیٰ پر نازل کی تھی۔ بلکہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ وہ موسیٰ کے انتقال سے بہت دن کے بعد تصنیف کی گئی ہیں۔

انجیل اوراس کی موجودہ حیثیت

توریت کے بعد دوسرا نمبر انجیل کا ہے اس لئے کہ وہ عیسائیوں کی مقدس کتاب ہے جو مذاہب عالم کی مردم شماری میں اس وقت اول درجہ رکھتے ہیں۔ بیشک انجیل آسمانی کتاب ہے جو رب کی جانب سے عیسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی لیکن کیا اس کا وجود باقی ہے اور کیا موجودہ اناجیل جن کے ہزارہا زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں اور ہر سال لاکھوں کی تعداد میں شایع ہوتے ہیں ان میں کوئی حصہ اور کوئی جزو بھی یقینی طور پر وحی آسمانی ہے؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔

انجیل کے متعلق گوناگوں وجوہ پر نظر کرنے سے اس امر کا کوئی اطمینان باقی نہیں رہتا کہ موجودہ

اناجیل میں وحی الٰہی کا بھی کوئی حصہ ہے۔

پہلی وجہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسیٰ پر جو انجیل نازل ہوئی تھی وہ ایک ہی تھی اس میں دو تین چار یا اس سے زیادہ کی تعداد کا پتہ نہ تھا لیکن انجیل کے نام سے جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان کی تعداد دس بیس پچاس سے گذر کر سو بلکہ اس سے زیادہ تک پہونچ گئی جس کی تصریح اورشین۔ اذیب۔ شیردم وغیرہ اکابر مسیحیین کے کلمات میں موجود ہے۔

عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے چار سو برس بعد اختلافات سے عاجز آکر ان پانچ انجیلوں پر اتفاق کیا گیا جن میں سے چار یہی ہیں کہ جو مشہور ہیں اور ایک انجیل صبوہ ہے جس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور وہ بطرس کی طرف منسوب ہے جس میں مریم کی زبانی مسیح کے بچپنے کے حالات کا تذکرہ ہے۔ اس صورتِ حال کے دیکھنے پر کیا یہ امر صاف ظاہر نہیں ہے کہ انجیل کا اصلی نسخہ عیسائیوں کے پاس موجود نہ تھا اسی لئے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

جس شخص کا دل چاہا اس نے اٹھ کر اپنے دل سے ایک انجیل تصنیف کر کے عیسیٰ کی طرف منسوب کردی اور اگر فرض بھی کیا جائے کہ ان نسخوں میں سے کوئی ایک حقیقی انجیل کا نسخہ تھا تو کیا ممکن نہیں کہ ان پچانوے چھیانوے میں سے ہو کہ جنھیں درجۂ اعتبار سے ساقط کر کے چھوڑ دیا گیا اور ان چار پانچ انجیلوں میں سے کوئی بھی حقیقی انجیل سے تعلق نہ رکھتا ہو۔

اور اگر وہ نسخہ ان چار کے اندر موجود بھی ہو تو جبکہ ان چار میں لفظی و معنوی ہر قسم کے اختلاف اور تناقضات پائے جاتے ہیں تو اس کی تعیین کیونکر ہوسکتی ہے اور درصورت عدم تعیین ان چاروں کو برابر سے کلام الٰہی اور وحی آسمانی سمجھنا جو عیسائیوں کا نقطۂ نظر ہے کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے؟

دوسری وجہ

اس وقت کہ جب مسیح شیطان کی آزمائش کے بعد واپس ہوئے ہیں اور پہلے پہل بیت المقدس کی طرف گئے ہیں کہ اپنی رسالت کی تبلیغ یہود میں کریں تو پہلی بات جو عیسیٰ کی زبان سے نکلی تھی وہ یہ کہ ’’زمانہ کا دور پورا ہو چکا ہے اور خدائی سلطنت کا عہد قریب آگیا ہے۔ اب تم لوگ توبہ کرو اور انجیل پر ایمان لاؤ۔‘‘

(انجیل مرقس باب ۱ آیت ۱۵)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی چیز اس وقت موجود تھی جس کا نام انجیل تھا اور کون نہیں جانتا کہ اس وقت جو ابتدائی دور رسالت مسیح کا تھا ان واقعات میں سے جو موجودہ اناجیل کے اندر مذکور ہیں کسی کا پتہ بھی نہ تھا۔ اسی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ موجودہ اناجیل وہ نہیں ہیں کہ جن پر عمل کی دعوت عیسیٰ نے اپنے ابتدائے نبوت ہی سے دی تھی۔

تیسری وجہ

مسیحی دیانت کی نشوونما ناصرہ میں کچھ ماہی گیروں کے گروہ میں ہوئی تھی جن کو علم اور ادب سے کوئی بہرہ نہ تھا اور پھر یہ لوگ یہودیوں کی کثیر التعداد جماعت کے اندر بیکسی اور بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے اس لئے مسیح کے واقعات اور تعلیمات خود ان کے زمانہ میں قلمبند نہ ہوئے مسیح کو بھی ان ہمت شکن مصائب کی بدولت جو انھیں آخر وقت تک یہودیوں کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑے جن کی وجہ سے ان کو بہت کم عمر ہی میں زمین پر سے اٹھا لئے جانے کی ضرورت محسوس ہوئی یہ موقع نہ مل سکا کہ وہ اپنے تعلیمات کی جمع آوری کا انتظام کریں۔ ان کے ساتھ والوں کو جو آخر تک تعداد میں بہت کم رہے تھے اتنا بھی موقع نہ ملا تھا کہ وہ اس انجیل کو جو عیسیٰ پر نازل ہوئی تھی اپنے پاس نقل کر کے محفوظ رکھ سکیں اور اس انجیل میں سے سوائے بعض فقرات کے جو معدودے چند افراد کو کہیں کہیں پر سے یاد تھے کوئی جزو بھی ان کے پاس قید تحریر میں نہ تھا مسیح کے اٹھائے جانے کے بعد ہی ان میں جنگ وجدال کا بازار گرم ہو گیا جس میں ہزاروں آدمیوں کی جانیں تلف ہوئیں اور ان پریشانیوں کے باعث مذہبی بنیادوں کے مضبوط کرنے کی کوئی فکر نہ ہو سکی۔

وہ چند فقرات انجیل کے جو سینوں میں محفوظ تھے ان میں بھی امتداد زمانہ نے تغیر و تبدل پیدا کر دیا پھر جس کو اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا ہوا اس نے اپنی طرف سے اضافہ کر کے ایک انجیل تیار کر دی جس کی صحت کا دارومدار بھی صرف اسی شخص کے دعوے پر ہے جو اس انجیل کا مصنف ہے۔

چوتھی وجہ

موجودہ اناجیل میں سب سے زیادہ معتبر و مستند انجیل متیٰ ہے اس لئے کہ متی باتفاق مسیحیین حوارین حضرت عیسیٰ میں سے تھے اور ان کی انجیل مسیح کے اٹھائے جانے کے آٹھ برس کے بعد تمام دیگر اناجیل سے

پہلے عالم وجود میں آئی ہے لیکن اس انجیل کی تاریخ اتنی تاریک ہے کہ اس میں تحقیق کا روشن ترین چراغ بھی جھلملا کر گل ہونے لگتا ہے۔

یہ امر شواہد وتصریحات کی بناء پر نا قابل انکار ہے کہ انجیل متی کی اصل عبرانی زبان میں تھی جو انھوں نے تازہ ایمان لانے والے یہودیان اور شلیم کی خاطر سے لکھی تھی لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انجیل کا دو اصلی نسخہ اب دنیائے مسیحیت میں موجود نہیں ہے اور وہ آج یا آج سے سو برس پہلے نہیں بلکہ دوسری یا تیسری صدی عیسوی ہی میں مفقود ہو چکا تھا۔ اس کے مفقود ہونے کے بعد یہ ترجمہ نکلا جو یونانی زبان میں ہے اور جواب دوسری زبانوں کے تراجم کی اصل ہے لیکن اس مترجم کا کوئی پتہ نہیں معلوم ہے کہ یہ کون شخص تھا اور اس کے خصوصیات کیا تھے؟ وہ مسیحی تھا یا یہودی یا کسی دوسرے مذہب کا شخص؟ اور آیا اس کو اس ترجمہ کے ذریعہ سے مسیحی تعلیمات کا پھیلانا مقصود تھا یا انکو مٹانا؟ اور کیا وہ عبرانی و یونانی دونوں زبانوں میں اتنی قابلیت بھی رکھتا تھا کہ اس کے ترجمہ پر کامل اعتماد کیا جائے؟ اور مذکورۂ بالا صورت حال میں کیا یہ شبہ پیدا نہیں ہوتا کہ ترجمہ کی نشر واشاعت کے موقع پر اصل انجیل کا مفقود کر دینا اسی غرض سے تھا کہ جو دل بخواہ تصرفات کئے گئے ہیں ان کا راز فاش نہ ہوسکے اور جو پردہ ان پر پڑا ہوا ہے وہ زیادہ گہرا ہو جائے اور کسی شخص کو موقع نہ ہو کہ وہ اصلی نسخہ کے ساتھ مطابقت کر کے اس کی غلطیوں کو طشت از بام کر دے۔

پھر جب یہ صورت ہے تو نصاریٰ کی سادہ لوحی نہیں تو کیا ہے کہ وہ اس انجیل پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور یقین کئے ہوئے ہیں کہ وہ متی کی لکھی ہوئی ہے؟ حالانکہ اس کے مترجم کا پتہ نہیں اور نہ معلوم کتنی گمراہ کن باتیں اس میں ایسی درج کر دی گئی ہیں جن سے نہ متیٰ کی روح خوش ہوگی اور نہ حضرت مسیح ان کو پسند فرماتے ہیں۔ کیا نہیں ممکن کہ عبرانی نسخہ کسی یہودی کے ہاتھ میں پڑ گیا ہو اور اس نے صرف مسیحی تعلیمات کو برباد کرنے کی غرض سے اس میں جو چاہا اپنی جانب سے تصنیف کر کے لگا دیا ہو۔

پانچویں وجہ

انجیل متی کے علاوہ جو انجیلیں ہیں ان کے مصنفین نے حضرت عیسیٰ کے تعلیمات کو بذات خود حاصل کرنا تو درکنار ان کی صورت بھی نہیں دیکھی۔

مرقس لاوی کی اولاد میں سے ایک یہودی شخص تھا جس نے بطرس کی شاگردی اختیار کی اور اہل

رومیہ کی فرمائش سے اس انجیل کوتصنیف کیا۔

(دیکھو کتاب مروج الاخبار فی تراجم الابرار مصنفہ بطرس قرماج مسیحی مطبوعہ بیروت ۱۸۸۰ء)

عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ مرقس نے اس انجیل کو پطرس کی صوابدید کے مطابق تیار کیا تھا اور اس طرح اس کا سلسلہ عیسیٰ کے حوارین تک پہونچتا ہے سند کا محتاج ہے۔ کسی کا دوسرے شخص کی شاگردی میں ہونا اس امر کا ذمہ دار نہیں ہوسکتا کہ شاگرد جو کچھ لکھے وہ حرف بحرف استاد کی طرف منسوب ہو۔

اب رہ گیا تیسری انجیل کا مصنف لوقا اس کے متعلق دنیائے نصرانیت میں اتنا اختلاف ہے کہ ہم اس کو جہالت اور گمنامی میں انجیل متی کے مترجم کا ثانی سمجھ سکتے ہیں۔

اتنا اتفاقی مسئلہ ہے کہ یہ شخص پولوس کا شاگرد تھا اور اس نے کبھی مسیح کی صورت نہ دیکھی تھی۔ یہ انطا کیہ کا رہنے والا طبیب تھا اور بعض نے کہا ہے کہ مصوّر تھا۔ بعض علمائے نصاریٰ نے اس کی تصریح کی ہے کہ لوقا نے اس انجیل کو مرقس والی انجیل کے بعد لکھا ہے اور اس وقت پطرس و پولوس دونوں کا انتقال ہو چکا تھا اور اس انجیل کے الہامی ہونے کا عقیدہ تو یہیں سے تشریف لے جاتا ہے۔

رہ گئی انجیل یوحنا اس کی حالت زیادہ گریہ خیز ہے۔ پہلے تو یہ امر پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچ سکا کہ اس انجیل کے مصنف وہ یوحنا ہیں جو عیسیٰ کے شاگردوں میں سے تھے بلکہ بعض علمائے مسیحیین کا خیال ہے کہ یوحنا کی انجیل مدرسۂ اسکندریہ کے ایک طالب علم کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

اور بعض ارباب تحقیق نے صاف طور پر لکھا ہے کہ انجیل اور جتنے رسالہ یوحنا کی طرف منسوب ہیں وہ ان کے نہیں ہیں بلکہ کسی نے دوسری صدی عیسوی کے اوائل میں انھیں تصنیف کرکے یوحنا کے سرتھوپ دیا ہے تاکہ لوگوں کی نظر میں ان کی قدر ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ اس کتاب کی سبب تصنیف جو بتلائی جاتی ہے وہ خود اس کے الہامی ہونے سے انکار کرتی ہے۔ اس کا تذکرہ ترجمہ انجیل مصنفہ جرجس زوین لبنانی مطبوعہ بیروت ۱۸۷۳ء میں موجود ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رومیہ میں بادشاہ کی جانب سے یوحنا کے متعلق حکم ہوا کہ وہ زندہ پکتے ہوئے تیل میں ڈال دیئے جائیں لیکن ان کو موت نہ آئی اس وقت وہ جزیرۂ باطموس کی طرف جلاوطن کردیئے گئے بادشاہ کے مرنے کی خبرسن کر یہ پھر مقام آفسس کی جانب گئے۔

شیرینطوس اور ابیسون اور ان کے ساتھ والے چونکہ مسیحی مذہب کو اس عقیدہ کے ساتھ رکھتے تھے

کہ عیسیٰ ایک انسان نہ تھے بلکہ خدائی کا درجہ رکھتے تھے اس لئے ۹۶ء میں تمام ایشیا کے پادری جمع ہوئے اور انھوں نے یوحنا سے خواہش کی کہ وہ حضرت عیسیٰ کے متعلق ایک انجیل تصنیف کریں جس میں وہ چیزیں درج ہوں جو اب تک دوسری انجیلوں میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں اور خاص طور پر اس میں مسیح کی الوہیت کو ثابت کریں۔ان لوگوں کے اصرار پر یوحنا کو مجبور ہونا پڑا اوران کی خواہش کو رد کرنا ممکن نہ ہوا۔

اس بیان سے حقیقت صاف نظر آنے لگتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس انجیل کے وجود میں آنے کا باعث کیا تھا؟ بات یہ ہے کہ عیسیٰ کے زمین پر سے اٹھنے کو جتنا زمانہ زیادہ گذرتا تھا نئے نئے اور بدعت آمیز عقیدوں کی پیداوار بڑھتی جاتی تھی اور حقائق کی جگہ توہمات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا تھا۔پہلی دوسری اور تیسری انجیل کی تصنیف تک عیسیٰ کی تعلیمات کا کچھ اثر باقی تھا جن کی بناء پر ان میں الوہیت مسیح کا صریحی تذکرہ نہیں ہے لیکن اس کے بعد اس عقیدہ نے کافی ترقی کی اور اس عقیدہ کے مبلغین نے محسوس کیا کہ یہ بہت بڑی کمزوری ہمارے اس عقیدہ کی ہے کہ ہماری انجیل اس سے خالی ہے اور ایسے اہم مسئلہ کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں ۔بس پھر کیا تھا۔ایک نئی انجیل کے تصنیف کی رائے ٹھن گئی اور آخر وہ یوحنا کے قلم سے پوری ہوگئی ۔کیا اس صورت حال کے بعد اس انجیل کو الہامی کہا جاسکتا ہے؟

مسیحیین نے یہ بات نکالی ہے کہ یوحنا نے جب انجیل لکھنے کا ارادہ کیا ہے تو مخصوص طور پر ایک قلبی نماز خدا کی بیعت کے ساتھ ادا کی تھی تا کہ روح القدس ان پر وحی لاتے رہیں لیکن افسوس ہے کہ رجوع قلب سے نماز پڑھنا اس امر کی سند نہیں ہوسکتا کہ اس انجیل میں جو کچھ لکھا گیا وہ روح القدس کی لائی ہوئی وحی سے ورنہ علمائے نصاریٰ روزانہ ایک قلبی و روحانی نماز پڑھ کے وحی اتروالیا کرتے اس سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ اناجیل میں کسی صورت سے بھی الہامی ہونے کا عقیدہ نہیں رکھا جاسکتا۔

چھٹی وجہ

خود انجیلوں کے دیکھنے اور سرسری نظر سے بھی ان کا مشاہدہ کرنے سے یہ امر ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ وہ کتاب نہیں ہے جو خدا نے عیسیٰ پر نازل فرمائی تھی بلکہ وہ درحقیقت مسیح کی تاریخ زندگی اور سوانح حیات کا مجموعہ ہے جس کو چار شخصوں نے متغائر لیکن ملتے جلتے پیرایوں میں جمع کیا ہے اور ایک کو دوسرے کے تحریرات سے اختلاف وتناقض کی پرواہ بھی نہیں ہے ان کی ابتداء اور انتہاء خود ان کی تاریخی حیثیت کی شاہد ہے۔انجیل متی کی

ابتداء ''باب اول کتاب نسب نامۂ عیسی مسیح بن داؤد بن ابراہیم'' سے اور انتہا وفات عیسیٰ اور ان کے دفن وکفن اور زندہ ہوکر آسمان کی طرف جانے پر ہوئی ہے، انجیل مرقس کی ابتداء یحییٰ تعمید دہندہ کے قصہ اور عیسیٰ کے بعض کرامات سے ہوئی ہے اور انتہا پھر عیسیٰ کی وفات ودفن وغیرہ کے حالات پر ہے۔انجیل لوقا کے شروع میں تو خود اس کے مصنف کی جانب سے بہت صاف صاف لکھا گیا ہے کہ یہ ان واقعات وحکایات کا مجموعہ ہے جو مجھ کو موثق ذرایع سے اور پیش رو معتبر راویوں سے معلوم ہوئے ہیں اور مجھ کو صلاح معلوم ہوئی کہ ان کو حرف بحرف سلسلہ وار تحریر کروں۔انتہا اس کی بھی عیسیٰ کی وفات اور اس کے بعد والے واقعات پر ہوئی ہے۔

انجیل یوحنا کی ابتداء بھی یحییٰ کی حکایت سے اور انتہا عیسیٰ کے انجام کار پر ہوگئی ہے اور آخر میں صریحی طور پر لکھا گیا ہے کہ یہ وہ واقعات ہیں جن کو عیسیٰ کے ایک شاگرد نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کو اپنے قلم سے لکھا ہے اور وہ مصنف انجیل کے نزدیک صحیح ودرست ہیں یہ عیسائیوں کی سادہ لوحی ہے کہ وہ باوجود ایسے صریح علامات وامارات کے موجودہ انجیل کو عیسیٰ پر اتری ہوئی الہامی کتاب سمجھتے اور اس کو وحی الٰہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

وید مقدس کی اصلیت

ہندوستان کے اصلی باشندے اور موجودہ زمانہ میں ہندوستان کے اندر اکثریت رکھنے والی قوم جو ہندو کے نام سے مشہور ہے۔اس کی مقدس کتاب کا نام وید ہے جو چار حصوں میں پائی جاتی ہے۔رگوید، یجروید۔سام وید تھروپ وید سناتن دھرمی ہندوؤں کا خیال ہے کہ ان چار کتابوں میں صرف وہ منتر ہیں جو عبادت کے موقع پر تلاوت کئے جاتے ہیں۔لیکن کسی قسم کے قانون اور قاعدے جو انسان کو صحیح راستہ پر لگائیں اور ایسے احکام جن کی پابندی فرض ہو وہ ان کے اندر موجود نہیں ہیں اور اگر ہیں تو وہ ایسے مبہم طور پر ہیں کہ جن سے اعلیٰ درجہ کے پاک نفس اور روشن ضمیر اشخاص ہی مستفید ہوسکتے ہیں۔اس بناء پر وہ لوگ براہمن گرنتھوں کو جن کے نام شت پتھ گو پتھ۔ایتر پتہ۔اور تانڈ پتہ ہیں وید کی جگہ پر سمجھتے ہیں اور انہی کو ہر طرح کے ہدایات کا مجموعہ خیال کرتے ہیں اور ان کے بعد منوسمرتی وغیرہ کا درجہ ہے لیکن سوامی دیانند سرسوتی جو آریہ سماج کے موسس اور بانی ہیں انھوں نے مذکورۂ بالا ویدوں کو بہت زیادہ اہمیت دے دی۔ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قسم کے احکام اور معارف انہی ویدوں سے حاصل کئے جاسکتے ہیں اور سوا ان چار ویدوں کے باقی کسی

کتاب سے سروکار رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس غرض کے لئے انھوں نے ستیارتھ پرکاش، لکھی ہے جس میں ویدوں کی تفسیر اپنے طبعزاد خیالات کی بناء پر اس عنوان سے کی ہے کہ معنی کو لفظ سے اور شرح کو متن سے کچھ لگاؤ ہی نہ معلوم ہو اور اس طرح انھوں نے اس دعوے کو حد ثبوت تک پہونچانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے ہر مشکل سے مشکل مسئلہ کو حل کرنے والے وید مقدس ہی ہیں۔ اس طرح پر آریہ مذہب کا تمام سرمایہ بلکہ شہرگ حیات وید ہی رہ جاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ جب ہم ان ویدوں کے سند و اعتبار پر نظر ڈال کر آخر کی کڑی کو اول سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں تو تاریکی کا ایک موج زن دریا سامنے آجاتا ہے جس میں اختلافات کے پر پیچ بھنور نقطۂ تحقیق کو دور سے دور تر بنا دیتے ہیں۔

ان ویدوں کی اصلیت اتنے پردوں میں مخفی ہے جن کا اٹھانا ان کے عقیدت مندوں کے امکان سے باہر ہے۔

پہلا پردہ

''وید کس پر نازل ہوئے'' یہی ایک ایسا سوال ہے جواب تک مسلمہ حیثیت سے طے نہیں ہوا ہے سناتن دھرمی صاحبان کا یہ قول ہے کہ دنیا کے شروع میں پرمیشور نے برھما نامی دیوتا کو پیدا کیا اور انہی کو یہ چاروں وید پڑھا دیئے، بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ وید چار نہیں بلکہ ایک ہی تھا۔ جسے برہما نے اپنے شاگردوں سے رشی لوگوں کو پڑھایا تھا اور بہت زمانہ کے بعد وہ ایک سے چار حصوں میں تقسیم کئے گئے۔ یورپ کی سنسکرت دان جماعت کا قول یہ ہے کہ چاروں وید چار مختلف زمانوں میں تصنیف ہوئے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے رگ وید ہے جو کہ نہایت قدیم ہے۔ کچھ سناتنی اصحاب کا یہ بھی قول ہے کہ اول ایک ہی وید تھا لیکن ویاس جی نے اس خیال سے کہ اس زمانہ کے لوگ اس قدر محنت نہ برداشت کر سکیں گے کہ اس کو پڑھیں اس کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا اور ہر ایک وید کو از بر کرنے والوں کے خاص خاص خاندان برہمنوں میں مخصوص ہو گئے چنانچہ ویدی (یعنی ایک وید والا) دوبے (دو وید والا) تواری (تین وید والا) چوبے (چار ویدوں والا) اب تک برہمنوں کی خاص خاص ذاتیں بنی ہوئی ہیں۔ ان سب کے خلاف سوامی دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج جو جدت طرازی کے گرویدہ تھے انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ چار وید چار شخصوں پر نازل ہوئے

ہیں جن کو رشی یا مہرشی کہا جاتا ہے اور وہ چاروں آغاز آفرینش میں بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے اور ان چاروں ملہموں سے ہی برہما جی نے چاروں ویدوں کو پڑھا تھا۔

(تفصیل کے لئے دیکھو کتاب تحفہ آریہ سماج، ج ۲)

پھر بھلا ایک ایسی کتاب کا کیا وزن ہوسکتا ہے جس کے متعلق خود اس کے ماننے والے اب تک طے نہ کر سکے ہوں کہ وہ نازل کس پر ہوئی تھی؟

دوسرا پردہ

وید خدائی کلام ہے یا مخلوق کا ساختہ؟ یہ بھی اب تک ہندوؤں اور آریوں میں مسلمہ حیثیت سے طے نہیں پایا ہے۔

کہیں تو یہ بلند بانگ دعویٰ ہے کہ ’’انسانی ایجاد سے میرا ایشور اور اس کے احکامات کے مبین کلمات کا نام وید ہے‘‘ دیکھو سرسوتی جی کی کتاب رگوید آدمی بھاشیہ بھومکا‘‘

(مطبوعۂ اجمیر طبع سوم، ص ۲۰)

اور اسی بناء پر آگے بڑھ کر ص ۲۹ پر ہے کہ ’’وید اور اس کے ماسوا جملہ الفاظ قدیم ہیں‘‘ حالانکہ قدامت کا دعویٰ ان تصریحات کے مطابق بالکل پادر ہوا ثابت ہوتا ہے جن میں سلسلۂ تخلیق و تکوین میں ویدوں کا تیسرا یا چوتھا نمبر قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ اتیر پتہ برہمن میں لکھا ہے۔

’’پرچاپتی نے خواہش کی کہ میں ظاہر ہوں بہت ہوں اس نے نہایت غور و خوض سے دیکھا اور اپنے پورے تدبیر کے بعد پرتھوی لوک (کرۂ ارض) انترکش لوک (عالم وسطی) اور دیولوک (عالم علوی) تین طبقوں کو پیدا کیا پھر ان تینوں طبقوں کو بنظر غور دیکھ کر ان سے تین جیوتی یعنی شعاعیں پیدا کیں طبقہ ارضی سے اگنی وسطی سے وایو اور علوی سے سوریہ ان تینوں جیوتیوں سے نہایت تفحص کے بعد اس نے تین وید پیدا کئے اگنی سے رگوید۔ وایو سے یجر وید اور سوریہ سے سام وید۔‘‘

اور اسی مضمون کی عبارتیں شت پتھ براہمن اور گوپتہ براہمن اور چھاندوگیہ اپ نشد میں بھی موجود ہیں۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پنڈت ستیہ دیو جی کی کتاب ’’ویدوں کے ظاہر کنندہ‘‘ مطبوعہ بنارس)

اور پرشنو آپ نشد کے چھٹے پرشن کے چوتھے منتر میں تو ویدوں کا ساتواں آٹھواں نمبر قرار دے دیا گیا ہے۔''اس ہستی مطلق نے (پہلے) پران کو پیدا کیا اس کے بعد امید کو اس کے بعد خلا ہوا۔آتش پانی اور زمین کو اس کے بعد حواس عشرہ اور دل کو ان کے بعد اناج سے مادۂ انسانی کو اس سے تپ (ریاضت) کو اس سے منتروں کو۔''

مذکورۂ بالا عبارات میں باوجود ان اختلافات کے جو موجود ہیں اتنا ضرور مشترک حیثیت سے پایا جاتا ہے کہ وید خدا کا کلام یا براہ راست اس کے مخلوق ہیں۔لیکن اس کے بالکل برخلاف بعض مقدس کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ویدوں کے بنانے والے انسانی نوع کے افراد ہیں اور ان کا براہ راست کوئی تعلق خدا سے نہیں ہے۔ چنانچہ ہری بنش پوران ادھیائے، شلوک ۵۰ سے ۵۳ تک لکھا ہے کہ ''منتر اور ویا کرن ان عالم علوی میں رہنے والے سات رشیوں کے تپ (ریاضت) کا نتیجہ ہیں کہ جنھیں دنیا دار لوگ ماضی و حال مستقبل تینوں زبانوں میں صاحب منتر و یا کرن اور باحشمت سمجھ کر سرنگوں ہوتے ہیں۔کیونکہ یہ ساتوں رشی سات اوصاف سے متصف عمر دراز منتروں کے مصنف و مالک کہلاتے ہیں۔''اور پنڈت ستیہ ورت سام شرمی اپنی کتاب (ترئی پرچئے)''ص ۴۷، میں تحریر کرتے ہیں۔

''وید ہمارے گذشتہ رشیوں کے ذریعہ بنائے گئے ہیں یہ بالکل صحیح عقیدہ ہے''۔

صاحب میمانسا کسی ایسے شخص کا قول نقل کرنے کے بعد جس کا خیال ہے کہ ''سمرتیان مستند نہیں ہیں اس لئے کہ دھرم کا سرچشمہ وید ہے، وید کے علاوہ سب کچھ غیر مستند یا قابل ترک ہے کیونکہ وہ خدائی کلام نہیں۔''

اس کے جواب میں رقمطراز ہیں کہ:۔

سمرتیان یقینی طور پر مستند ہیں کیونکہ ویدوں اور سمرتیوں دونوں کے بنانے والے برابر ہیں۔''

اس عبارت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ وید کے بنانے والے مثل سمرتیوں کے مصنفین کے انسان ہیں اور وہ خدائی کلام نہیں۔

(مہابھارت کادہارتک اتہاس) ص ۳۲ میں لکھا ہے کہ ''وید کسی خاص کتاب کا نام نہیں ہے بلکہ مختلف رشیوں کے لاثانی تجربات خاص اصولوں کے مجموعہ کا نام وید ہے۔''

ص ۳۵ میں ہے''پرانے زمانہ کے ہندوستانیوں نے خود ہی اپنی تاریخ ان ویدوں میں جمع کر رکھی ہے۔''

ص ۳۶۸ ''سنسکرت زبان میں جامع وید کے مانند اور کوئی کتاب پرانی نہیں مگر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ پانچوں جامع ایک ہی وقت میں تھے اور ان میں ایک ہی قسم کا دھرم ظاہر کیا گیا ہو'' ادینا اچاریہ کی کتاب کسمانجلی، ص ۴۳

''ویدانسانی کلام ہے کلام ہونے کی حیثیت سے مہابھارت کی طرح ویدانسانی حکایات ہیں۔''

پھر ایک ایسی کتاب جس کے متعلق خود اس کے معتقدین اس پر متفق نہ ہوں کہ وہ خدا کا کلام ہے وہ دوسرے افراد سے کس طرح اپنے الہامی ہونے کے سامنے سرتسلیم خم کراسکتی ہے؟

اور پھر جبکہ خود وید مقدس بھی اپنی ہستی کو پہچنوانے میں انہی لوگوں کا ہمخیال ہے جو اس کے ربانی ہونے کا انکار رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس میں صاف طور پر موجود ہے کہ ''وید نئے و پرانے رشیوں کے گیت ہیں'' (رگوید ۱۰۱۲،)

تیسرا پردہ

کاش وہ افراد جن کی طرف ان ویدوں کے تصنیف کی نسبت دی جاسکتی ہے ان کے نفسانی اوصاف اور اخلاقی کمالات ہی پر ایسی مسلمہ شہادتیں موجود ہوتیں جو ان کے کلمات کے سر اور آنکھوں پر رکھنے کی سند ہوسکتیں لیکن افسوس ہے کہ ان ویدوں کے مصنفین کا ذاتی تقدس واعتبار بھی کوئی مسلّمہ حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ''مہابھارت کا دھارمک اتہاس'' ص ۱۱۸ میں تو یہاں تک ہے کہ ''تینوں ویدوں کے بنانے والے ٹھگ چور اور شیطانی خصلت راکشس تھے۔''

چوتھا پردہ

وید کی حیثیت جو ابتدا میں تھی وہ ایک ہی صورت پر محفوظ بھی نہیں رہی بلکہ اس میں حسب دلخواہ تصرفات ہوتے رہے جن کی بناء پر یا تو وہ کتابیں بالکل بدل گئیں اور یا ان میں جا بجا حسب دلخواہ اضافہ ہوگئے۔

چنانچہ ''مہابھارت کا دھارمک اتہاس'' ص ۱۲۱ میں ہے۔ ''جینیوں کی کتابوں میں اس امر کا ثبوت پایا گیا ہے کہ اصل وید اور ہی تھے (بعد کو لوگوں نے نئے نئے وید بنا کر ان میں بہت سی حیوانی قربانیوں کا ذکر کرکے ان کی خوب اشاعت کی''۔

ص ۱۲۰ ’’آتمارام جینی کا بھی قول ہے کہ پرانے چار وید جین دھرم کو تسلیم تھے مگر جب سے برہمنوں نے ان میں ملاوٹ کر دی تب سے وہ غیر معتبر کر دیئے گئے۔

ص ۳۷ ’’ویدک دھرم کی پہلی تواریخی حالت کی نسبت رگوید ہی سب سے زیادہ مستند ہوسکتا ہے۔‘‘

ص ۳۸ ’’ساتھ ایک بات اور بھی ہے تمام رگوید سے ایک ہی وقت کا دھرم بھی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ نسبۃً اس کا بھی کوئی حصّہ نیا اور پرانا ہے۔

پانچواں پردہ

وید کے تعلیمات کسی محدود زمانہ کے لئے نہیں بلکہ غیر محدود تھے اس کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے جبکہ ہندوؤں کی کتابوں میں یہاں تک موجود ہے کہ ’’اس وقت وید بلا زہر کے سانپ کے مانند بے اثر ہے۔ اس وقت وید منتر بلا جان کے جانوروں کی طرح مردہ ہیں۔‘‘

منتر دیوار پر کشیدہ پتلیوں کے مانند ہیں جیسے ان پتلیوں کی تصویروں میں بظاہر تمام حواس نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں بالکل بے حس و حرکت ہوتے ہیں اسی طرح اس زمانہ میں وید منتر بھی بظاہر تو فائدہ مند معلوم ہوتے ہیں مگر اثر کے لحاظ سے قطعی بے سود ہیں۔ جیسے بانجھ عورتوں سے صحبت کرنے میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا اسی طرح فی زمانا وید منتروں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔‘‘

(شاستری پری چےئ نمبر ۸ ص ۲۷ بحوالہ مہانروان تنتر)

(مذکورۂ بالا مضامین کی اصل عبارتوں کے لئے ملاحظہ ہو پنڈت ستیہ دیو جی کی کتاب ’’وید کیا چیز ہے ‘‘۔ مطبوعۂ جونپور ۱۹۲۶ء)

کیا اتنی کمزوریاں جس کتاب میں پائی جاتی ہوں۔ یعنی جس کی اصل معلوم نہ ہو کہ وہ کس پر نازل ہوئی؟ وہ الہامی ہے بھی یا انسانوں کی بنائی ہوئی ہے؟ اس کے بنانے والے پاکباز اور پاک طینت افراد تھے یا بقول بعض ٹھگ چور وغیرہ؟ اور پھر اس کا سابقہ حیثیت پر باقی رہنا بھی مشکوک ہو جس کی بنا پر اس کے کسی جزو کے اوپر یقینی طور پر حکم نہ لگایا جاسکتا ہو کہ وہ خدا کا کلام ہے اور ان تمام جہتوں سے معتبر مان لینے کے بعد اس کے موجودہ زمانے میں قابل عمل ہونے پر بھی کوئی دلیل نہ ہو وہ کسی منظم بااصول مذہب کے لئے قابل عمل اور اقوام عالم کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوسکتی ہے؟ کیا یہ دیدہ دلیری نہیں تو کیا ہے کہ آریہ اپنے وید مقدس

کی ایسی کمزوریوں کے باوجود دنیا کو وید کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ قرآن مجید کے قدس و عظمت پر حرف گیری کرتے ہیں، کیا وہ دنیا کو ہمیشہ اپنے کتب کے اندرونی حالات سے بے خبر رکھ سکتے ہیں؟۔ کیا عالم کی آنکھوں پر غفلت کے پردے اس طرح پڑ سکتے ہیں کہ روشنی و تاریکی میں فرق محسوس نہ ہو؟ در حقیقت وید کی تاریخ اس حد پر تخیلات وتوہمات سے ڈھکی ہوئی ہے کہ اس میں سے ایک ذرہ بھی حقیقت کا دریافت ہونا دشوار نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

قرآن کریم کی امتیازی خصوصیات

مذکورۂ بالا کتب کے مقابلہ میں جب ہم اسلامی کتاب ''قرآن کریم'' پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ان تمام کمزوریوں سے بلند نظر آتی ہے جن کے باعث سے توریت یا انجیل یا وید کے اعتبار کو صدمہ پہونچا ہے بلکہ اس کی تاریخ ایسے خصوصیات پر مشتمل ہے جو اس کے استناد و اعتبار کے ضامن ہیں۔

پہلی خصوصیت

امت اسلامیہ کہ جو قرآن مجید کی امانت دار اور اس کی حفاظت ونگہداشت کی براہِ راست ضامن سمجھی جاسکتی ہے وہ حقیقی معنی میں باختلاف زمانہ اس کے صحیح تعلیمات سے کتنی دور ہوگئی ہو اور اس کی بناء پر اہل معنی اس پر ارتداد کا حکم لگادیں لیکن ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ اس نے ظاہر بظاہر قرآن کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑا ہو اور اسلام کے اصول اساسی کو چھوڑ کر کفر وشرک اختیار کیا ہو بلکہ جس وقت سے مسلمانوں نے دنیائے وجود میں قدم رکھا ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی رہی اور وہ برابر اسلام کو اپنا نشان قومیت اور قرآن کو اپنا طرۂ دستار بنائے رہے۔ ساڑھے تیرہ صدی میں تاریخ کسی ایسے وقت کا پتہ نہیں دے سکتی جس میں مسلمانوں نے قرآن مجید سے روگردانی اور اسلام سے کنارہ کشی کی ہو۔

دوسری خصوصیت

قرآن مجید کے متعلق ابتداء ہی سے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی کہ اس کا نسخہ کسی خاص شخص یا جماعت کے پاس محدود رہے بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو یہ حق حاصل رہا کہ وہ اسے لکھیں نقل کریں اور از بر یاد کریں۔

رسالتمآبؐ کی حیات میں آیتیں جو متفرق طور پر نازل ہوتی رہتی تھیں وہ فوراً صحابہ کے گوش گذار

کردی جاتی تھیں اور برابر مختلف صحابہ ان آیتوں کو جو ان تک پہونچتی تھیں اپنے پاس لکھتے رہتے تھے اور اس طرح اگرچہ قرآن مجید ایک کتاب کی صورت میں جمع نہ ہوا ہو لیکن کافی ذخیرہ اس کا کثیر التعداد اشخاص کے پاس مکتوبی صورت میں یا سینوں کے اندر محفوظ تھا۔

عوض اس کے کہ کوئی پابندی عائد ہوتی برابر جناب رسالت مآبؐ کی جانب سے قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو حفظ کرنے کی ہدایت ہوتی تھی۔ اطراف و جوانب میں قرآن کی تعلیم کے لئے لوگ روانہ کئے جاتے تھے اور قرآن کا زیادہ مقدار میں علم رکھنے والے کے لئے مخصوص امتیازات مقرر تھے۔ حضرت رسولؐ کے انتقال کے بعد بھی یہ صورت قائم رہی اور حضرت عمر نے نماز تراویح کی ایجاد کر کے حفظ قرآن کی اہمیت میں ایک باب کا اضافہ کر دیا اور اب پورا قرآن نمازوں میں ختم کیا جانے لگا اور جتنا اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اتنا قرآن مجید کے نُسخ میں اضافہ ہوا اور دور دور کے شہروں تک قرآن کے نسخہ نقل کرا کرا کر بھیجے گئے۔ یہاں تک کہ بوقت واحد ہزار ہا نسخہ اس کے طول وعرض دنیا میں منتشر نظر آنے لگتے۔

اس طرح ان توہمات کا بالکل قلع قمع ہو گیا جو توریت وانجیل کے اندر یہود و نصاریٰ کی سیکڑوں برس تک پردہ داری نے پیدا کر دیئے تھے۔

تیسری خصوصیت

قرآن مجید اپنی اصلی زبان (عربی) میں موجود ہے اور صرف موجود نہیں بلکہ ہر مسلمان قرآن صرف اسی کو سمجھتا ہے جو مخصوص الفاظ پر مشتمل ہے ان کے شرعی احکام بھی اسی قرآن سے تعلق رکھتے ہیں نماز میں اس کا پڑھنا لازم اور دیگر مواقع پر اسی کی تلاوت اجر وثواب کی باعث قرار دی گئی ہے، رہ گئے تراجم وہ صرف ناواقف افراد کے لئے معانی سمجھنے کا ذریعہ ہیں، قرآنی احکام سے ان کو کوئی تعلق نہیں برخلاف تورات وانجیل کے کہ انجیل متی کا تو اصلی زبان والا نسخہ ہی دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اور دوسرے اناجیل و کتب عہدین اگرچہ اصلی زبانوں میں موجود ہیں لیکن خود ان کے ماننے والے ان کے الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس لئے ہر سال ہزاروں زبانوں میں ان کے ترجمے شایع ہوتے ہیں اور عیسائی مبلغین ہر عیسائی جماعت میں داخل ہونے والے کو اسی زبان کی انجیل و تورات دیتے ہیں جس کا وہ جاننے والا ہے لیکن عبرانی نسخہ تورات وانجیل کا اس کی عام طور پر مسیحی افراد پڑھنا تو در کنار صورت تک نہیں دیکھتے۔

چوتھی خصوصیت

قرآن مجید کے آیات کو متفرق طور پر خود رسالت مآبؑ بوقت ورود ہی قلمبند کرالیا کرتے تھے اور پھر ان متفرق آیات کو بعد حضرت کی وفات کے جمع کیا ایسے افراد نے جو حضرت کی صحبت میں بیٹھے ہوئے اور حضرت کے مدرسۂ فیض کے تعلیم یافتہ تھے اور اس طرح وہ کمزوری جو اناجیل میں اس طرح پیدا ہوگئی کہ ان کے لکھنے والوں میں سے بیشتر افراد نے عیسیٰ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی قرآن کریم میں پائی نہیں جاتی۔

پانچویں خصوصیت

قرآن مجید کی ابتداء انتہا۔ اس کا اسلوب اور طریقۂ بیان سب اس کے کلام الٰہی اور منزل من اللہ ہونے کا منادی ہے۔ وہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ کی تاریخ زندگی نہیں ہے جس میں ان کی ولادت سے لے کر وفات تک کے تفصیلی حالات کا تذکرہ ہو اور نہ اس میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہے جو رسولؐ کی وفات یا اس کے بعد سے تعلق رکھتے ہوں جن کی بنا پر اس کے رسولؐ پر نازل ہونے میں شبہہ کیا جائے اور نہ اس میں غیر خدا کسی کی زبان سے اس قسم کے فقرات ہیں کہ اس کو میں نے مستند راویوں کے کلام سے اخذ کر کے لکھا ہے اور یہ وہ واقعات ہیں جنھیں کسی صحابی نے چشم دید مشاہدہ کی بناء پر نقل کیا ہے جس کا نمونہ ہم عیسائیوں کے اناجیل میں دکھلا چکے ہیں بلکہ اس میں ہر ہر جملہ اس خصوصیت کا خزینہ دار ہے کہ وہ خدا کی جانب سے نازل شدہ کلام ہے۔ اس نے ''انا انزلناہ فی لیلۃ القدر۔ انا نحن نزلنا الذکر'' وغیرہ آیات میں اس کے تنزیل من اللہ کا صراحت کے ساتھ اعلان کیا اسی طرح اس میں ہر موقع پر ماضی وحال کے واقعات میں توازن کو ملحوظ رکھ کر اپنے زمانۂ نزول کی تعیین میں واہمہ پردازیوں کا سدّ باب کر دیا اس نے رسولؐ کی وفات کا بھی تذکرہ کیا ہے اس طرح کہ ''افئن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم (سورہ آل عمران آیت ۱۴۴)'' جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ رسولؐ کی زندگی کا کلام ہے نہ یہ کہ وہ انجیل کی طرح رسول کی وفات کے گذشتہ واقعہ ہونے کی بناء پر اس پر نوحہ سرائی کے لئے بیٹھ جاتا جو اس کے رسول کے بعد نوزائیدہ ہونے پر قطعی دلیل ہوتی۔

چھٹی خصوصیت

قرآن مجید کی اصلیت وحقیقت کے متعلق مسلمانوں کے اندر باوجود آپس کے ہزار ہا گونا گوں

اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ وہ متفقہ حیثیت سے اس نقطہ پر مجتمع ہیں کہ قرآن مجید خداوند عالم کا نازل کردہ رسولِ عربی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل شدہ ہے اور یہ کہ اس میں کسی انسان کی ساخت و پرداخت کو کوئی دخل نہیں ہے اس طرح وید میں اس کے ماننے والوں کے ایک نقطہ پر مجتمع نہ ہونے کی حیثیت سے جو کمزوری پائی جاتی ہے اس سے قرآن مجید پاک ومنزّہ ہے۔

ساتویں خصوصیت

قرآن مجید کے متعلق اس کے ماننے والے اس امر پر متفق ہیں کہ وہ دنیا کے آخری نقطہ تک کے لئے رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ کہ وہ کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہے۔ اس کے تعلیمات دنیا میں بقا۔ ودوام کے مالک ہیں اور اس کے ہدایات زمانہ کے ہر جزو کے لئے مساوی طور پر فائدہ مند ہیں اور اس طرح وہ ہر زمانہ میں خود بھی اپنی طرف دعوت دیتا ہے اور اس کے معتقدین کے لئے بھی عالم بھر کو اس کی طرف دعوت دینے کا حق ہے۔

آٹھویں خصوصیت

یہ قرآن جب سے عالم وجود میں آیا، اس کے ہر ہر لفظ اور ہر جملہ کی جانچ پرتال ہوتی رہی اور ذمہ دار افراد کی توجہ اس کی کتابت وحفظ کے سلسلہ میں اصلی الفاظ کی نگہداشت اور معمولی سے معمولی خصوصیت حتیٰ اعراب وطریق اداء وغیرہ کے متعلق ذرہ بینی پر منعطف رہی اور اس طرح قرآن مجید میں کسی غیر معلوم تصرف یا تحریف کا امکان باقی نہیں رہا جو اس کے سند واعتبار کو صدمہ پہونچانے کا باعث ہو۔

قرآن کریم آپ اپنا معیار ہے

ارباب قلم کی علمی وادبی شاہکاریں جو کسی پہلو سے امتیاز کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ ان میں قلم کا رنگ ڈھنگ اہل نظر کی نظر کو ایک خاص پیمانہ کا عادی بنا کر ان کی قوت ادراک کو امتیاز کا جوہر دے دیا کرتا ہے جس کی بناء پر ایک نادیدہ عبارت بھی ان کے سامنے پیش ہو تو وہ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ یہ اس کتاب یا مضمون کا جزو ہے یا نہیں چہ جائیکہ قرآن مجید جو اپنے مخصوص طرز ادا اور اسلوب بیان میں اس امتیاز کو لے کر دنیا کے سامنے آیا تھا جس نے عالمِ انسانیت کے ہر جزو وکل کو اپنے معاوضہ کی دعوت دے کر ان سے عجز کا اعتراف کرالیا اور جس کے سامنے تمام قوائے عمل اور انسانی ذرائع واسباب نے اپنی شکست کا اقرار کر کے اس کی کامل

فتحیابی کی تصدیق کردی۔اس نے زیادہ سے زیادہ مطالبہ میں پوری کتاب اور کم سے کم میں اپنے مختصر ترین سورہ کو پیش کر کے دعوائے یکتائی کیا اور زمین و آسمان کی درمیانی فضا نے صدیاں گذرنے کے بعد بھی ساکن رہ کر اپنے خاموش نغموں سے اس کے دعوے کی گواہی دی اس کا مخصوص طرز بیان وطریقۂ ادا صرف آیات کے فصل ووصل اور ان کے اختتامی فواصل میں مضمر نہیں ہے جس کا تتبع ایک انشاء نگار کے لئے دشوار نہ ہو ورنہ علی محمد باب کی کتاب البیان اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی حمامۃ البشریٰ وخطبہ عیدالاضحیٰ میں اس جوہر کی کمی نہیں ہے بلکہ وہ اس کے الفاظ کی نشست اور جملوں کے جوڑ پیوند اور عبارات کی ساخت و پرداخت اور الفاظ ومعانی کے مخصوص توازن وتناسب میں اس حیرت انگیز پیرایہ کا نام ہے جس نے غیروں کو جادو اور اپنوں کو معجزہ کہنے پر مجبور کیا۔اسی کا نتیجہ ہے کہ جب فصیح سے فصیح عبارت میں قرآن مجید کا ایک جملہ آجاتا ہے تو وہ اس طرح نمایاں ہوتا ہے جیسے سنگریزوں میں موتی اور نہیں تو ستاروں میں ماہتاب اور اس بناء پر کسی ایک جزو کلام کے متعلق جس میں جزو قرآن ہونے کا شبہ ہو یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ حقیقۃً وہ قرآن کا جزو ہے یا نہیں۔اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ قرآن خود آپ اپنا معیار ہے۔

اگر درایت کوئی چیز ہے اور روایت کا درایت پر انطباق عقلی بنیاد پر ضرور ہے تو کسی راوی کا قول کہ فلاں سورہ یا آیت قرآن کا جزو تھا اس وقت تک قابل اعتماد نہیں جب تک وہ خود اپنے جزو قرآن ہونے کی گواہی نہ دے رہا ہو اور اس طرح خواہ اہل سنت کا روایتی سورۂ حفد وخلع ہو یا بعض شیعوں کا سورۂ ولایت کسی صورت پر جزو قرآن تسلیم نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ جب اس کو مسلّمہ آیات قرآن کے پہلو میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو وہی نسبت معلوم ہوتی ہے جو سنگریزوں کو گوہر شاہوار سے۔

اور اس طرح اکثر ان آیات کی بھی حقیقت کھل جاتی ہے جن کے متعلق رطب و یابس جمع کرنے والے محدثین نے جزو قرآن ہونے کے روایات نقل کردیئے ہیں۔

یہ نویں خصوصیت ہے قرآن مجید کی جو اس کے علاوہ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں پائی جاتی کیونکہ ان کتابوں میں کوئی قدر متیقن یعنی تعیین کے ساتھ یقینی جزو موجود ہی نہیں ہے جس کو ہم شک وشبہ کی صورت کا معیار قرار دیں برخلاف قرآن مجید کے کہ وہ یقینی حیثیت سے اتنا کہ جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے باتفاق کل اور روایت ودرایت دونوں کے اعتبار سے خدا کا کلام ہے اور وہی مشکوک ومشتبہ صورتوں کے لئے

معیار بننے کی صلاحیت رکھتا ہے پھر دوسری کتابوں میں لفظ و معنیٰ اور انداز بیان کے اعتبار سے کوئی ایسی خصوصیت بھی مضمر نہیں ہے جو کسی دوسرے کلام کو اس سے لگاؤ نہ رکھنے دے لیکن قرآن مجید وہ اپنے ذاتی خصوصیات کی بناء پر خود اپنا معیار بننے کے قابل ہے اور اس طرح وہ خود بے اصل تو ہمات کا سد باب اور بے بات کی بات بنانے والوں کی زبان بندی کے لئے کافی اور مہیّا ہے۔

سند حجیت یا میزان اعتبار

زمانہ کے اجزاء اپنے حوادث سمیت گذرنے والے ہیں اور اس میں پیدا ہونے والی مخلوق سلسلۂ تدریج کی پابند ہے اور اس لئے آخر میں پیدا ہونے والی نسلیں اولین اسلاف کے برکات سے اس وقت تک بہرہ مند نہیں ہوسکتیں۔ جب تک وسطی حلقے امانت داری کے ساتھ ان کے پس انداز جواہر کو خود محفوظ رکھ کران کے سپرد نہ کریں۔ یونہی آخر کی کڑی اوّل سے اور مستقبل کا سلسلہ ہزاروں برس قبل کے ماضی بعید سے متصل ہوجاتا ہے۔ گذشتہ مصنفین کے علمی وادبی جواہر پارے یونہی مسلم حیثیت سے موجود پائے جاتے ہیں کہ مستند رواۃ اور معتمد ناقلین نے دست بدست ان کی نگہداری کر کے امانت کے فرض کو انجام دیا ہے اور باخبر افراد نے ان کے انتساب کی مسلمہ طور پر تصدیق کر کے اس میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے۔

یہی تواتر جو کثیر التعداد راویوں کے متفقہ بیانات سے یقینی طور پر ثبوت بہم پہونچنے کا نام ہے کسی کتاب کے یقینی حیثیت سے صحت و اعتبار کا ضامن ہے لیکن اس کے بعد بھی وہ کتاب اس وقت مشکوک ہوجائے گی جب مسلمہ شہادات سے اس کا محرف ہونا ثابت ہوجائے گا اس طرح کہ اس کے ہر ہر جزو میں احتمال زیادتی وکمی کا پیدا ہو یعنی اجمالی طریقہ سے اس امر کا علم ہو کہ اس میں کچھ زیادتی ہوئی ہے یا ایسی کمی جس نے اس کے مطلوبہ اغراض و مقاصد پر اثر ڈال کر اس کو ناقص بنا دیا ہے۔

اس صورت میں اس کا ہر جزو شک وشبہہ کا مرکز بن جائے گا اور کسی جزو پر بھی اس کے یقینی طور پر حکم نہ لگایا جاسکے گا کہ وہ اصل کتاب کا جزو ہے لہٰذا مجموع کتاب کے ساتھ اس کے ہر جزو پر بھی اعتماد پیدا ہونے کے لئے دو باتوں میں سے کسی ایک بات کی ضرورت ہے۔

(۱) مستند وجوہ کی بنا پر اس کے کسی جزو میں بھی زیادتی وکمی کے شبہہ کا سد باب ہوگیا ہو اور اس میں کسی ایک کلمہ کے بھی زیادہ وکم ہونے کا ثبوت نہ ہو۔

(۲) اگر اس امر کا یقین ہو کہ اس میں کہیں زیادتی یا کمی ہوئی ہے تو مستند وجوہ کی بناء پر اس زیادتی و کمی کے مقامات اور ان کی نوعیت کا علم ہو گیا ہو اور بقیہ حصہ کے متعلق کوئی ضمانت ہو جو اس کی حجیت و اعتبار کی قطعی طور پر دستاویز سمجھی جا سکے۔

اسی طرح اس کتاب پر اعتقاد رکھنا حق بجانب اور اس پر عمل کرنا صحیح و جائز ہوگا۔

ایمان بالقرآن کے اگر صرف یہ معنی ہوں کہ حقیقی کتاب جو رسولؐ نے قرآن کریم کے نام سے پیش کی تھی وہ یقینا خدا کا کلام اور سچا معجزہ ہے تو اس کے لئے موجودہ اجزاء قرآن میں کسی بحث و تمحیض کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسا ایمان مسلمانوں کو توریت و انجیل اور دیگر کتب سابقہ پر بھی لازم ہے باوجودیکہ ان کا وجود دنیا میں باقی نہیں اور جو موجود ہیں وہ حقیقی توریت یا انجیل کہنے کے قابل نہیں ہیں لیکن اگر ایمان بالقرآن کے معنی یہ ہیں کہ موجودہ اجزائے قرآن پر جو بین الدفتین موجود ہیں اعتقاد رکھ کر اس کے کلام خدا اور اس کے ہر جزو کے مستند اور واجب العمل ہونے کا یقین رکھیں اور یہ ایک مخصوص امتیاز ہو جو تمام کتب سابقہ کے مقابلہ میں قرآن مجید کو حاصل ہے تو اس ایمان بالقرآن کے لئے ضرورت اسی بات کی ہے کہ اس میں تحریف و تبدیل کے احتمال کا سد باب ہو جائے یا ان موارد کی تعیین ہو جن میں نقص و زیادتی کا شبہہ ہے اور بقیہ حصہ کے متعلق ایسے وجوہ ہوں جو اس کے اعتبار و استناد کی قطعی دلیل سمجھے جا سکتے ہیں۔

قرآن کریم کی نسبت فریقین کا زاویۂ نگاہ

تحریف قرآن کے روایات اور ان کا سند و اعتبار کے معیار سے تطابق۔ ایمان بالقرآن کی اصلیت اور طرفین کے مذہبی اصول کا توازن

مذکورۂ بالا اصول اور میزان اعتبار کی بناء پر جب ہم عام اسلامی جماعت کے ان محدثین و مورخین کے بیانات پر نظر ڈالتے ہیں کہ جو اپنے تئیں۔۔ ایمان بالقرآن کا واحد ٹھیکہ دار بتا کر دوسروں پر ایمان بالقرآن نہ رکھنے کا الزام عائد کرتے ہیں تو ان بیانات میں ایسی کمزوریاں نظر آتی ہیں جن سے قرآن مجید کے تواتر اور اس کے صحت و اعتبار میں طرح طرح کے شبہ پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ اور اگر انھیں صرف انہی محدثین و رواۃ کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو کسی صورت سے ایمان بالقرآن کا دعویٰ حق بجانب معلوم نہیں ہوتا۔

جمع قرآن کی کیفیت

اس سلسلہ میں حسب ذیل واقعات مستند کتب احادیث وسیر میں درج پائے جاتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید جناب رسالتمآبؐ کے زمانہ میں اگرچہ متفرق طور پر قلمبند ہو چکا تھا۔لیکن کتاب کی صورت میں اس کی جمع وتدوین نہ ہوئی تھی جس کی تصریح ائمہ فن کے حسب ذیل بیانات میں صاف طور پر پائی جاتی ہے۔

قال الدّیرعا قولی فی فوائده حدثنا ابراهیم بن بشار حد ثنا سفیان بن عیینة عن الزهری عن عبید عن زید بن ثابت قال قبض النبی صلی الله علیه وسلم ولم یکن القران جمع فی شئی۔

’’دیرعاقولی نے اپنی سلسلہ وار سند سے خود زید بن ثابت جامع قرآن کی زبانی نقل کیا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے انتقال کیا ایسی حالت میں کہ قرآن یکجا صورت سے جمع نہیں ہوا تھا۔‘‘(۱)

اورخود حافظ سیوطی نے مسلم کی ایک حدیث کی توجیہ کرتے ہوئے اس کا مسلّمہ حیثیت سے اعتراف کیاہےاورلکھاہے:

’’قد کان القرآن کتب کله فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم لکن کان غیر مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السور‘‘۔

قرآن عہد حضرت رسولؐ میں پورا مرتب ہو چکا تھا لیکن وہ ایک جگہ پر جمع نہ تھا اور نہ اس کے سورے مرتب تھے۔(۲)

خطابی نے اس مسلّمہ حقیقت کی اپنے مذاق پر توجیہ بھی کی ہے جس کو علامہ سیوطی حسب ذیل الفاظ میں نقل کرتے ہیں: قال الخطابی انما لم یجمع القرآن صلی الله علیه وسلم فی المصحف لما کان یترقبه من ورود ناسخ بعض احکامه او تلاوته‘‘۔حضرت نے قرآن مجید اس لئے مصحف میں جمع نہیں کیا تھا کہ آپ کو خیال تھا شاید کوئی حکم یا آیت اس کی منسوخ ہوجائے۔(ص،۵۸)

۱۔اتقان سیوطی،ج۱،ص ۵۸ ۲۔اتقان،ص۵۹

بیہقی ہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی ازالۃ الخفاء میں تحریر فرماتے ہیں ''آن تا آخر زمان آنحضرت مجموع در مصاحف نبود۔''اور شاہ عبدالحق محدث دہلوی تفسیر حقانی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں۔

''آنحضرت نے اپنی حیات میں تمام قرآن لکھوا کر ایک جلد میں جمع نہیں کیا ہے۔''

(ص، ۸۳)

(۲) حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد فوراً ہی عام طور پر صحابۂ کرام نے جمع قرآن کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ ان اشخاص پر اعتماد رہا جو متفرق طور سے اپنے سینوں کے اندر قرآن کے آیات اور سوروں کو محفوظ کئے ہوئے تھے اسکے بعد جب فتنہ ارتداد نے زور پکڑا اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یمامہ کی جنگ میں کثیر جماعت حفاظ میں سے قتل ہوگئی اس وقت حضرت عمر کو قرآن مجید کے جمع وتالیف کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے لئے زید بن ثابت کو منتخب کیا گیا اور اس کا تذکرہ صحیح بخاری ''باب جمع القرآن''میں حسب ذیل صورت سے موجود ہے۔

ان زید بن ثابت قال ارسل الیّ ابو بکر مقتل اهل الیمامة فاذا عمر بن الخطاب عنده فقال ابو بکر انّ عمر اتانی فقال ان القتل قد استحرّ یوم الیمامة بقرآء القرآن وانی اخشی ان یستحرّ القتل بالقرّاء بالمواطن فیذهب کثیر من القرآن وانی اریٰ ان تأمر بجمع القرآن قلت لعمر کیف تفعل شیئا لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم قال عمر هذا والله خیر فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح الله صدری لذلك ورأیت فی ذالك الذی رأی عمر قال زید قال ابوبکر انك رجل شاب عاقل لا نتهمك وقد کنت تکتب الوحی لرسول الله صلی الله علیه وسلم فتتبع القرآن فاجمعه فوالله لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علیّ مما امرنی به من جمع القرآن قلت کیف تفعلون شیئا لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم قال هو والله خیر فلم یزل ابو بکر یراجعنی حتی شرح الله صدری للذی شرح له صدر ابی بکر و عمر فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال حتی وجدت

اخر سورة التوبة مع ابی خزیمة الانصاری لم اجدھا مع احد غیرہ لقد جآء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما اعنتّم حریض علیکم حتی خاتمہ البرائۃ فکانت الصحف عند ابی بکر حتی توفاہ اللہ ثم عند عمر حیاتہ ثم عند حفصة بنت عمر۔

زید بن ثابت کا بیان ہے کہ مجھ کو حضرت ابوبکر نے اہل یمامہ کے قتل ہونے کے بعد بلوا بھیجا، وہاں عمر بن الخطاب بھی موجود تھے، حضرت ابوبکر نے کہا کہ بھئی عمر میرے پاس آئے اور انھوں نے کہا کہ یمامہ کی جنگ میں حفاظ قرآن کا ستھراؤ ہوگیا ہے اور مجھے خوف ہے کہ یونہی دوتین لڑائیوں میں اگر حفاظ قرآن مارے گئے تو قرآن مجید کا کثیر حصہ ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن مجید کے یکجا جمع کئے جانے کا حکم دیجئے۔ میں نے یہ سن کر ان سے کہا کہ بھلا ایسی بات کیونکر کر سکتے ہو جس کو رسالت مآبؐ نے نہیں کیا تھا؟ عمر نے کہا کہ یہ بات تو خدا کی قسم اچھی ہی اچھی ہے۔ اس کے بعد سے برابر عمر مجھ سے اس امر میں تبادلۂ خیالات کرتے رہے یہاں تک کہ خدا نے میرے دل کو اس امر کے لئے کشادہ کردیا اور میری بھی رائے ان کی رائے کے موافق ہوگئی۔

(پھر زید بن ثابت کو مخاطب کرکے) تم نوعمر جوان سال اور عقلمند آدمی ہو اور تم پر ہمیں اعتماد بھی ہے اور تم حضرت رسولؐ کے لئے وحی کے کاتب بھی رہ چکے تھے۔ لہٰذا تم قرآن مجید کو مختلف مقامات سے تتبع کرکے جمع آوری کے کام کو انجام دو۔

(زید کا بیان ہے) یہ سننا تھا کہ میرے حواس اڑ گئے خدا کی قسم اگر مجھ سے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کو کہا جاتا تو وہ میرے اوپر اتنا ہی گراں ہوتا جتنا کہ اس وقت یہ جمع قرآن کا حکم گراں تھا۔ میں نے کہا کہ آخر آپ لوگ ایسی بات کیونکر کریں گے جو رسالت مآبؐ نے نہیں کی تھی۔ حضرت ابوبکر نے کہا یہ تو مفید کام ہے اور اس میں اچھائی ہی اچھائی ہے۔ اس کے بعد بار بار حضرت ابوبکر مجھ کو ٹوکتے رہے یہاں تک کہ میں بھی حضرت ابوبکر و عمر کا ہم خیال ہوگیا اور میں نے قرآن مجید کو درخت کی چھالوں اور پتھر کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے کہ جن میں اس کے متفرق آیات محفوظ تھے جمع کرنا شروع کیا یہاں تک کہ سورۂ توبہ کا آخری حصہ ''لقد جآء کم رسول من انفسکم الخ'' مجھ کو صرف ابوخزیمہ انصاری کے پاس موجود ملا۔ یہ جمع شدہ صحیفے حضرت ابوبکر کے پاس رکھے گئے اور ان کے بعد حضرت عمر اور پھر حفصہ

بنت عمر کی طرف منتقل ہوئے۔(۱)

حضرت ابوبکر کے اس فقرہ سے کہ **کیف تفعل شیئا لم یفعل رسول اللہ** اور اسی طرح زید بن ثابت کے کہنے سے کہ **کیف تفعلون شیئا لم یفعله رسول اللہ** صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید رسالتمآبؐ کے زمانہ میں جمع نہ ہوا تھا اور اب اس کے مقابلہ میں حاکم کی اس روایت کا وزن باقی نہیں رہتا کہ قرآن جناب رسالتمآبؐ کے زمانہ میں جمع ہو چکا تھا اور یہ کہ زید بن ثابت کا بیان ہے کہ

''**عند النبی صلی اللہ علیه وسلم نؤلف القرآن من الرقاع**'' ہم حضرت رسولؐ کے زمانہ میں قرآن مجید کو مختلف کاغذ کے پرزوں سے جمع کرتے تھے''۔ جب کہ امام بخاری کی روایت اس کے خلاف ہے اور پھر زید کی یہ روایت صریحی طور سے اس امر کو بتلاتی بھی نہیں کہ قرآن کے اجزاء کتاب کی صورت میں یکجا جمع کئے جارہے تھے۔ چنانچہ حافظ سیوطی نے اس روایت کو نقل کرنے پر امام بیہقی کی توجیہ نقل کردی ہے کہ **یشبه یکون المراد به تالیف ما انزل من الایات المتفرقة فی سورها و جمعها فیها باشارة النبی صلی اللہ علیه وسلم**۔ قریبی احتمال یہ ہے کہ اس جمع و تالیف سے متفرق آیات کو مقررہ سوروں کے آیات کے ساتھ ملا کر یکجا کرنا مراد ہو جس کا رسالتمابؐ نے حکم دیا تھا۔(۲)

دوسری بات جو بخاری کی حدیث سے صاف طور پر ثابت ہے وہ یہ کہ قرآن مجید کے جمع و تالیف کا کام صرف ذاتی اعتماد کی بنا پر انفرادی حیثیت سے زید بن ثابت کے سپرد کر دیا گیا تھا اور اس بناء پر زید بن ثابت نے جتنی بھی چھان بین کی ہو اور جس کد و کاوش سے بھی اس کو جمع کیا ہو لیکن مجموعی حیثیت سے اس کی صحت و اعتبار کا انحصار زید بن ثابت ہی کی امانتداری و وثاقت پر رہ جاتا ہے۔

اور پھر زید بن ثابت کا یہ بیان کہ ''میں نے قرآن مجید کو متفرق درخت کی چھالوں اور پتھر کے ٹکڑوں اور مختلف لوگوں کے محفوظات کا تتبع کر کے جمع کیا اس امر کی صریحی دلیل ہے کہ قرآن مجید اس وقت مجموعی حیثیت سے کسی شخص کو بھی صحابہ میں سے یاد نہ تھا ورنہ اتنی زحمت برداشت کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

(۳) زید بن ثابت کا انتہائی اہتمام یہ تھا کہ وہ کسی آیت کو اس وقت تک درج نہ کرتے تھے جب تک دو عادلوں کی گواہیاں حاصل نہ ہوتی تھیں چنانچہ علامہ سیوطی لکھتے ہیں۔

---

(۱) بخاری مطبوعہ کرزن پریس دہلی، ص ۷۴۵ ۔۲۔ اتقان، ج ۱، ص ۶۰

قد اخرج ابن اشتہ فی المصاحف عن لیث بن سعد قال اول من جمع القرآن ابو بکر و کتبہ زید بن ثابت و کان الناس یاتون زید بن ثابت فکان لا یکتب آیۃ الا بشاھدی عدل و انّ اخر سورۃ البرائۃ لم توجد الا مع خزیمۃ بن ثابت فقال اکتبوھا فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعل شھادت بشھادۃ رجلین فکتب وان عمر اتی بآیۃ الرجم فلم یکتبھا لانہ کان وحدہ۔

ابن اشتہ نے کتاب المصاحف میں لیث بن سعد کی زبانی نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے قرآن کو جمع کیا وہ حضرت ابو بکر ہیں اور زید بن ثابت اس کے لکھنے والے تھے اور لوگ زید بن ثابت کے پاس (قرآن کی آیتوں کو لے کر) آتے تھے مگر وہ کوئی آیت نہ لکھتے تھے جب تک کہ دو عادل شخص اس کی گواہی نہ دے لیتے تھے اور سورۂ برائت کا آخری حصہ صرف خزیمہ بن ثابت کے پاس دستیاب ہوا تو وہ صرف انہی کی گواہی پر لکھوالیا گیا اس لئے کہ ان کی گواہی کو جناب رسالت مآبؐ نے دو گواہیوں کے برابر قرار دیا تھا اور حضرت عمر آیہ رجم کو لے کر آئے تو اس کو درج نہیں کیا گیا اس لئے کہ وہ تنہا تھے ان کے موافق کوئی دوسرا گواہ نہ تھا۔(۱)

اس روایت سے بے شک زید بن ثابت کی کدو کاوش کا اندازہ ہوتا ہے۔لیکن کیا اس صورت حال نے قرآن مجید کی عظمت میں کوئی اضافہ کیا یا اس کو محفوظ رکھا؟ کیا اس کے آیات میں شاہدین عدلین کے گواہی کی ضرورت اس کے مسلّم شان تواتر کو صدمہ نہیں پہونچاتی؟ کیا وہ صحابہ جن کے اقوال کو کسی دوسرے کی گواہی نہ ہونے کے سبب سے رد کر دیا گیا۔ یقینا دروغ گو اور افترا پرداز تھے؟ تو پھر عدالت صحابہ کے عقیدہ کا کیا حشر ہوگا؟ اور جب وہ یقینی طور پر کاذب نہیں ہیں تو کیا اس امر کا یقین اور کم سے کم شبہ نہیں پیدا ہوتا کہ ان صحابہ کی بتلائی ہوئی آیتوں میں معتد بہ تعداد حقیقی آیات قرآن کی تھی جو اس قرآن میں درج ہونے سے رہ گئیں۔

بعض روایتوں میں زید بن ثابت کا قدم درمیان سے نکال دیا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق خود بنفس نفیس جمع قرآن کے انتظام میں مصروف تھے چنانچہ علامۂ سیوطی لکھتے ہیں:۔اخرج ابن ابی داؤد من طریق یحییٰ بن عبدالرحمن بن حاطب قال قدم عمر فقال من کان تلقی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئا من القرآن فلیات بہ و کانوا یکتبون ذلک فی

۱۔ اتقان، ج ۱ص ۶۰

الصحف والالواح والعسب وکان لا یقبل من احد شیئا حتی یشھد شھیدان۔

ابن ابی داؤد کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے صحابہ کے مجمع میں آکر اعلان کیا کہ جس کسی شخص نے کوئی حصہ بھی قرآن کا حضرت رسولؐ سے حاصل کیا ہو وہ اس کو لاکر پیش کرے اور وہ لوگ قرآن کی آیتوں کو کاغذوں، تختیوں اور درخت کی چھالوں پر لکھا کرتے تھے اور حضرت عمر کسی شخص کے دعوے کو قبول نہ کرتے تھے جب تک دو گواہ اس کی گواہی نہ دیتے تھے۔(۱)

لیکن اس روایت میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت عمر نے آیۂ رجم کو جو ان کی نظر میں یقینا جزو قرآن تھی کیوں درج نہ کیا اس لئے کہ ذاتی علم کے بعد عادلین کی گواہیوں کا انتظار کوئی معنی نہیں رکھتا؟ ہاں مگر یہ کہ حضرت عمر پورے طور پر اس معاملہ میں خود مختار نہ رہے ہوں بلکہ زید بن ثابت ان کے شریک کار قرار دیئے گئے ہوں جیسا کہ تیسری روایت سے ثابت ہوتا ہے جس کو علامۂ سیوطی نے حسب ذیل الفاظ میں نقل کیا ہے:۔ **واخرج ابن ابی داؤد ایضا من طریق ھشام بن عروۃ عن ابیہ ان ابابکر قال لعمر و لزید اقعدا علیٰ باب المسجد فمن جاء کما بشاھدین علی شیئی من کتاب اللہ فاکتباہ۔**

عروہ بن زبیر کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر نے عمر اور زید سے کہا کہ تم دونوں آدمی مسجد کے دروازہ پر بیٹھو اور قرآن مجید کی جس آیت پر دو گواہیاں حاصل ہو جائیں اس کو درج کرلو۔(۲)

بہر حال خواہ پہلی صورت ہو یا دوسری یا تیسری یہ امر پایۂ ثبوت تک پہونچ گیا کہ آیات قرآن کے تسلیم کرنے میں شہادت عدلین کی شرط لگائی گئی تھی اور یہی امر قرآن کی جامعیت میں شبہہ پیدا کرنے کا باعث ہے۔

طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امر میں پورا اہتمام تھا کہ قرآن میں کوئی ایسی چیز درج نہ ہونے پائے جو حقیقۃً قرآن کا جز نہیں ہے۔ لیکن یہ امر اس قدر مورد اہتمام نہ تھا کہ قرآن کی کوئی آیت رہ جانے بھی نہ پائے ورنہ کسی صحابی کے قول کو صرف اس بناء پر رد نہ کر دیا جاتا کہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا گواہی دینے والا نہیں۔

۱۔ اتقان، ج ۱، ص ۵۹

۲۔ اتقان، ج ۱، ص ۶۰

اب بتاؤ کہ وہ تمام صحابہ جن کے قول کوانفراد کی بناء پر رد کر دیا گیا تھا اس قرآن کو ناقص سمجھتے تھے یا نہیں جب کہ وہ صداقت کے ساتھ ایک ایسی آیت کو جزوِ قرآن سمجھتے ہیں جو اس قرآن میں درج نہیں۔

پھر کیا ایک ایسا مسلمان جو قرآن موجود میں زیادتی کا انکار اور اس کے ہر ہر جزو کے کلام خدا ہونے کا اقرار رکھتے ہوئے کہیں کہیں سے اس کی بعض آیتوں کے متعلق یہ رائے رکھتا ہو کہ وہ درج ہونے سے رہ گئیں۔ کافر اور غیر مومن بالقران سمجھا جاسکتا ہے؟ اور کیا اس فتوائے کفر کی زد میں بہت سے صحابہ کرام نہ آجائیں گے؟

جمع قرآن کے بعد

حضرت ابوبکر نے زید بن ثابت کے ہاتھوں اس صورت سے جس کا تذکرہ ہو چکا قرآن مجید کتابی صورت میں جمع تو کرا دیا لیکن نشر و اشاعت کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ جیسا کہ بخاری کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے وہ کتاب ان کے پاس محفوظ رہی اور پھر حضرت عمر نے اس کو اپنے پاس امانت رکھا اور ان کے انتقال پر ان کی صاحبزادی حفصہ کے قبضہ میں آیا۔ عام مسلمانوں کے لئے وہی صورت حال جو اس کے قبل تھی باقی رکھی گئی یعنی مختلف صحابہ قرآن مجید کے متفرق حصوں کو اپنے سینوں میں اور مکتوبی صورت میں منتشر اجزاء اپنے پاس محفوظ رکھے ہوئے تھے اور وہی قرآن مجید کی تعلیم کے ذمہ دار اور اس کی نگہداری و حفاظت کے ضامن و متکفل تھے اور ان میں سے بھی مخصوص صحابہ جو قرآن مجید کو غیر مرتب حیثیت میں مکمل طور پر حفظ کئے ہوئے تھے انہوں نے اپنے اپنے مذاق پر ترتیب دے کر قرآن مجید کو مرتب و مدون بھی کیا۔

امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے علاوہ جن کے جمع قرآن پر مبسوط بحث مستقل طور پر کی جائے گی دیگر مستند و مسلم صحابہ جنھوں نے قرآن مجید کو اپنی اپنی ترتیب کے مطابق جمع کیا تھا عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، معاذ بن جبل تھے اور ابوموسیٰ اشعری نے بھی اپنے محفوظات کی بناء پر ایک قرآن جمع کیا تھا جسے اہل بصرہ میں مقبولیت حاصل تھی اور وہ ان کے اندر ’’لباب القلوب‘‘ کے نام سے مشہور تھا۔

(اعجاز القرآن مصنفۂ شیخ مصطفی صادق رفاعی مطبوعۂ مصر، ص ۳۱، ۳۸)

اختلاف مصاحف

مذکورۂ بالا مصاحف جنھیں مختلف اشخاص نے اپنے اپنے محفوظات پر جمع کیا تھا ان میں ترتیب کی

حیثیت سے اختلاف تھا جس کی تفصیلی کیفیت ابن اشتہ نے کتاب المصاحف میں اورانہی سے حافظ سیوطی نے اتقان میں اس طرح نقل کی ہے۔

ترتیب مصحف موجود		ترتیب مصحف ابی مسعود	ترتیب مصحف ابن مسعود
۱	حمد	حمد	بقرہ
۲	بقرہ	بقرہ	نساء
۳	آل عمران	نساء	نساء
۴	نساء	آل عمران	آل عمران
۵	مائدہ	انعام	اعراف
۶	انعام	اعراف	انعام
۷	اعراف	مائدہ	مائدہ
۸	انفال	یونس	یونس
۹	برائت	انفال	برائت
۱۰	یونس	برائت	نحل
۱۱	ہود	ہود	ہود
۱۲	یوسف	مریم	یوسف
۱۳	رعد	شعراء	کہف
۱۴	ابراہیم	حج	بنی اسرائیل
۱۵	حجر	یوسف	انبیاء
۱۶	نحل	کہف	طٰہٰ
۱۷	بنی اسرائیل	نحل	مومنون
۱۸	کہف	احزاب	شعراء

۱۹	مریم	بنی اسرائیل	صافات
۲۰	طٰہٰ	زمر	احزاب
۲۱	انبیاء	طٰہٰ	حج
۲۲	حج	انبیاء	قصص
۲۳	مومنون	نور	نمل
۲۴	نور	مومنون	نور
۲۵	فرقان	سبا	انفال
۲۶	شعراء	عنکبوت	مریم
۲۷	نمل	مومن	عنکبوت
۲۸	قصص	رعد	روم
۲۹	عنکبوت	قصص	یٰس
۳۰	روم	نمل	فرقان
۳۱	لقمٰن	صافات	حجر
۳۲	سجدہ	ص	رعد
۳۳	احزاب	یٰس	سباء
۳۴	سبا	حجر	فاطر
۳۵	فاطر	شوریٰ	ابراہیم
۳۶	یٰس	روم	ص
۳۷	صافات	حدید	محمد
۳۸	ص	فتح	لقمان
۳۹	زمر	محمد	زمر
۴۰	مومن	تحریم	مومن

۴۱	حم سجدہ	ملک	زخرف
۴۲	شوریٰ	سجدہ	سجدہ
۴۳	زخرف	نوح	شوریٰ
۴۴	دخان	احقاف	احقاف
۴۵	جاثیہ	ق	جاثیہ
۴۶	احقاف	رحمن	دخان
۴۷	محمد	واقعہ	فتح
۴۸	فتح	جن	حشر
۴۹	حجرات	نجم	حم سجدہ
۵۰	ق	معارج	طلاق
۵۱	ذاریات	مزمل	قلم
۵۲	طور	مدثر	حجرات
۵۳	نجم	قمر	ملک
۵۴	قمر	حم سجدہ	تغابن
۵۵	رحمن	دخان	منافقون
۵۶	واقعہ	لقمان	جمعہ
۵۷	حدید	جاثیہ	صف
۵۸	مجادلہ	طور	جن
۵۹	حشر	ذاریات	نوح
۶۰	ممتحنہ	قلم	مجادلہ
۶۱	صف	حاقہ	ممتحنہ
۶۲	جمعہ	حشر	تحریم

٦٣	منافقون	ممتحنہ	رحمن
٦۴	تغابن	مرسلات	نجم
٦۵	طلاق	نباء	طور
٦٦	تحریم	قیامہ	ذاریات
٦٧	ملک	تکویر	قمر
٦٨	قلم	طلاق	واقعہ
٦٩	حاقہ	نازعات	نازعات
٧٠	معارج	تغاب(۱)	معارج
٧١	نوح	عبس	مدثر
٧٢	جن	تطفیف	مزمل
٧٣	مزمل	انشقاق	تطفیف
٧۴	مدثر	تین	عبس
٧۵	قیامہ	علق	دہر
٧٦	دہر	حجرات	مرسلات
٧٧	مرسلات	منافقون	قیامہ
٧٨	نباء	جمعہ	نباء
٧٩	نازعات	تحریم	تکویر
٨٠	عبس	فجر	انفطار
٨١	تکویر	بلد	غاشیہ
٨٢	انفطار	لیل	اعلیٰ
٨٣	تطفیف	انفطار	لیل
٨۴	انشقاق	شمس	فجر

۸۵	بروج	طارق	بروج
۸۶	طارق	اعلیٰ	انشقاق
۸۷	اعلیٰ	غاشیہ	علق
۸۸	غاشیہ	صف	بلد
۸۹	فجر	تغابن	ضحیٰ
۹۰	بلد	بیّنہ	طارق
۹۱	شمس	ضحیٰ	عادیات
۹۲	لیل	انشراح	ماعون
۹۳	ضحیٰ	قارعہ	قارعہ
۹۴	انشراح	تکاثر	بیّنہ
۹۵	تین	عصر	شمس
۹۶	علق	خلع	تین
۹۷	قدر	حفد	ہمزہ
۹۸	بیّنہ	ہمزہ	فیل
۹۹	زلزال	زلزال	قریش
۱۰۰	عادیات	عادیات	تکاثر
۱۰۱	قارعہ	فیل	قدر
۱۰۲	تکاثر	قریش	زلزال
۱۰۳	عصر	ماعون	عصر
۱۰۴	ہمزہ	کوثر	نصر
۱۰۵	فیل	قدر	کوثر
۱۰۶	قریش	کافرون	کافرون

۱۰۷	ماعون	نصر	تبت
۱۰۸	کوثر	تبت	اخلاص
۱۰۹	کافرون	اخلاص	انشراح
۱۱۰	نصر	فلق	
۱۱۱	تبت	ناس	
۱۱۲	اخلاص		
۱۱۳	فلق		
۱۱۴	ناس	(۲)	

مصحف حضرت علیؑ اور ترتیب نزول

مذکورۂ بالا اسلوب کہ جو مختلف صحابہ کی طرف سے جمع قرآن میں اختیار کئے گئے تھے اس صورت کے یقینا خلاف ہیں جس پر قرآن مجید نازل کیا گیا تھا۔

اس لئے کہ بتصریح محققین سب سے پہلا سورہ جو جناب رسالتمآبؐ پر نازل ہوا ہے وہ سورۂ اقرأ تھا اور اس کے بعد مدثر۔ چنانچہ علامہ سیوطی اتقان میں تحریر کرتے ہیں۔

اختلف فی اول ما نزل من القران علیٰ اقوال احدھا وھو الصحیح اقرأ باسم ربك۔ ''اختلاف ہوا ہے کہ سب سے پہلے قرآن کا کون جزو نازل ہوا پہلا قول جو حقیقۃً صحیح ہے وہ یہی ہے کہ سب سے پہلا نازل ہونے والا ٹکڑا اقرأ باسم ربك ہے اور اسی کی تصدیق میں پھر انھوں نے صحیحین کی حدیث کو نقل کیا ہے۔'' دیکھو اتقان، ج ۱ ص ۲۴

اور واحدی نے اپنی کتاب اسباب النزول (طبع مصر، ص ۵)

۱۔ اتقان کے مطبوعہ نسخہ میں یونہی ہے لیکن اس کے محتاج تصحیح ہونے میں شبہہ نہیں ہے۔ فہرست ابن ندیم میں نازعات اور عبس کے درمیان کسی سورہ کا نام نہیں ہے۔

۲۔ اتقان، ج ۱ ص ۶۶

میں اول ما نزل من القرآن کے تحت میں لکھا ہے اقرأ باسم ربك الذی خلق عن عكرمة والحسن قالا اول ما نزل من القران بسم الله الرحمن الرحيم فهو اول ما نزل من القران بمكة واوّل سورة اقرأ باسم ربك۔ سورة المدثر اول ما نزل بعد سورة اقرأ۔

’’عکرمہ اور حسن کا بیان ہے کہ سب سے پہلے جو آیت قرآن کی مکہ میں نازل ہوئی وہ بسم اللہ ہے اور سب سے پہلا سورہ اقرأ ہے اور اس کے بعد دوسرا سب سے پہلا سورۂ مدثر ہے۔‘‘

ص۸، اول سورة نزلت علیٰ رسول الله بمكة اقرأ باسم ربك وآخر سورة نزلت علیٰ رسول الله بمكة المومنون ويقال العنكبوت واول سورة نزلت بالمدينة ويل للمطففين وآخر سورة نزلت فی المدينة برأة۔

سب سے پہلا سورہ جو رسالت مآبؐ پر مکہ میں نازل ہوا ’’اقرأ‘‘ ہے اور آخری سورہ جو مکہ میں اترا مومنون اور بقول بعض عنکبوت ہے اور مدینہ میں سب سے پہلا سورہ ویل للمطففین اور آخری سورہ برأت ہے۔

اب ان روایات کی مطابقت سے جب موجودہ ترتیب قرآن پر نظر کرو تو تمہیں بالکل عکس نظر آئے گا۔

سورۂ برأت جو سب سے آخری سورہ ہے وہ قرآن کی پہلی تہائی میں اور اقرأ جو سب سے پہلا سورہ تھا وہ آخری پارہ میں اور مدنی سوروں میں کا پہلا سورہ مطففین بھی اسی صورت سے آخر میں ڈال دیا گیا ہے اور اس طرح موجودہ ترتیب کو کوئی مناسبت ترتیب نزول کے ساتھ باقی نہیں رہتی اور معلوم ہوتا ہے کہ ان صحابۂ کرام کی نظر میں ترتیب نزول کی مراعات کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ خود حضرت عائشہ ام المومنین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اس وقت جب ایک عراقی شخص نے آکر عرض کیا۔ ’’اے ام المومنین مجھ کو اپنا مصحف دکھلایئے‘‘ فرمایا ’’کیوں‘‘ کہا لعلی اؤلف القرآن عليه فانه يقرأ غير مؤلف ’’شاید میں اپنے قرآن کو اسی کے موافق ترتیب دے لوں اس لئے کہ بحالت موجودہ وہ بلا ترتیب پڑھا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا وما يضرك اية قرأت قبل انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار حتیٰ اذا ثاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اوّل شیئ لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا لقد نزل بمكة علیٰ محمد صلی الله عليه وسلم وانی لجارية العب بل الساعة موعدهم

والساعة ادھیٰ وامر وما نزلت سورۃ البقرۃ والنساء الا وانا عندہ قال فاخرجت له المصحف فاملت علیه السور۔

''تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ جو سورہ بھی پہلے پڑھ لیا جائے۔ سب سے پہلے مفصل سوروں میں سے ایک سورہ اترا تھا جس میں بہشت و دوزخ کا تذکرہ تھا یہاں تک کہ جب لوگ کثرت سے اسلام کی طرف آ گئے تو حلال وحرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلی ہی مرتبہ **لا تشربوا الخمر** نازل ہو جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم ہرگز شراب ترک نہ کریں گے اور اگر پہلے ہی یہ حکم آتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔ مکہ میں رسالت مآبؐ پر یہ آیت نازل ہوئی کہ **بل الساعة موعدھم والساعة ادھیٰ وامر** ۔ اس وقت میں بچہ تھی اور کھیلتی پھرتی تھی اور سورۂ بقرہ ونساء اس وقت نازل ہوئے کہ جب میرا حضرت کے ساتھ عقد ہو چکا تھا'' اس کے بعد ام المومنین نے اپنا مصحف نکالا اور اس کے مطابق سوروں کی فہرست لکھوادی۔(۱)

اس حدیث سے جس طرح قرآن موجود کا ترتیب نزول کے خلاف ہونا ظاہر ہے اس لئے کہ **بل الساعة موعدھم** الخ سورۂ قمر کی آیت ہے جو بحالت موجودہ ستائیسویں پارہ میں ہے اور وہ حضرت ام المومنین کے قول کے مطابق سورۂ بقر ونساء سے بہت پہلے نازل ہوئی تھی۔

اسی کے ساتھ یہ امر بھی نمایاں ہے کہ موصوفہ کی نظر میں قرآن کی ترتیب کسی خاص تعبد وتوقیف پر مبنی نہ تھی۔ اور نہ وہ کسی خاص ترتیب کا پابند ہے اسی لئے وہ عراقی کی کاوش کو بلا ضرورت قرار دیتے ہوئے **مایضرك ایّة قرأت** کہہ کر سور قرآن میں ترتیب کی مراعات کو ساقط کیے دے رہی ہے۔

براء بن عازب کی روایت بھی بخاری میں موجود ہے کہ **تعلمت سبّح اسم ربك قبل ان یقدم النبی صلی الله علیه وسلم المدینة** ''میں نے سبح اسم ربك کو اس وقت یاد کیا ہے کہ جب رسالت مآب مدینہ میں ہجرت کر کے تشریف بھی نہ لائے تھے''۔

اس سے ظاہر ہے کہ سورۂ اعلیٰ ہجرت کے قبل نازل ہو چکا تھا حالانکہ وہ بحالت موجودہ قرآن کے آخری پارہ میں نظر آ رہا ہے۔

۱۔ صحیح بخاری، مطبوعہ کرزن پریس دہلی، ص ۷۴۷

ترتیب آیات

جس طرح سوروں کی ترتیب اس ترتیب سے مختلف ہے کہ جس پر قرآن نازل ہوا تھا اسی طرح آیات کا اگر لحاظ کیا جائے تو ان میں بھی ترتیب نزولی کا پتہ نہیں ہے جس کے کئی ثبوت ہیں۔

(پہلا ثبوت)

مکی سوروں کے بیچ میں مدنی آیتیں اور مدنی سوروں میں مکی آیتیں حالانکہ مکی و مدنی کی اصطلاح جس اصول پر قائم ہوئی ہے اس کے مطابق ترتیب نزولی کی مراعات کے ساتھ مکی و مدنی آیتوں میں خلط و آمیزش ناممکن ہوجاتی ہے۔

علامۂ سیوطی تحریر فرماتے ہیں اعلم ان للناس فی المکی والمدنی اصطلاحات ثلثة اشھر ھا ان المکی مانزل قبل الھجرۃ والمدنی ما نزل بعدھا سوآء نزل بمکة ام بالمدینة عام الفتح او عام حجة الوداع ام بسفر من الاسفار ۔مکی و مدنی کے متعلق مختلف اصطلاحیں ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ مکی وہ ہے جو قبل ہجرت نازل ہوا ہو اور مدنی وہ کہ جو بعد ہجرت خواہ مکہ میں نازل ہوا ہو یا مدینہ میں سال فتح مکہ یا حجۃ الوداع یا کسی دوسرے سفر میں۔(۱)

اب عقلی حیثیت سے یہ امر تو ممکن ہے کہ کسی سورہ کی ابتدائی آیتیں مکی اور آخری آیتیں مدنی ہوں لیکن اول کے مدنی ہونے کے ساتھ آخر کا مکی ہونا یا اول و آخر مدنی کے ساتھ وسط مکی یا اول و آخر مکی ہونے کے ساتھ وسط کا مدنی ہونا ترتیب نزول کے لحاظ سے ممکن نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ جب ہم سور قرآن اور ان کے آیات پر ائمہ تفسیر و علمائے سیر و تواریخ کے بیانات کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں تو ان میں ان تینوں طرح کے نمونوں کا ایک عالم نظر آتا ہے جس کا اندازہ مندرجۂ ذیل فہرست سے ہو سکے گا:

(۱) انعام

یہ سورہ مکی ہے لیکن سات آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی ہیں جو ایک ساتھ مذکور بھی نہیں بلکہ ان کے درمیان آیات مکیہ مخلوط ہیں۔

---

(۱) (اتقان، ج۱،ص۶)

''الّذین اٰتیناھم الکتاب یعرفونه کما یعرفون ابنائھم الّذین خسروا انفسھم فھم لا یومنون' (سورہ انعام آیت ۹۱)

اس کے قبل اور بعد آیتیں مکی ہیں اور یہ خود مدنی ہے پھر وما قدروا اللہ حق قدرہ اذ قالوا ما انزل اللہ علی بشر من شیئی الخ

(سورہ انعام آیت ۱۹)

ابن ابی حاتم کی تصریح کے مطابق یہ آیت مالک بن صیف کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ مدینہ کا واقعہ ہے۔اس کے بعد ایک آیت مکی ہے اور پھر ومن اظلم ممّن افتریٰ علی اللہ کذبا او قال اوحی الیّ ولم یوح الیه شیئی

(سورہ انعام آیت ۹۳)

الایة اور اس کے بعد والی آیت یہ دونوں مسیلمہ کذّاب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جس کے ادعائے نبوت کا زمانہ رسالتمآبؐ کی زندگی کے آخری دور میں تھا اور یہ بحالت موجودہ مکہ میں نازل ہونے والے سورۂ انعام کے وسطی حصہ میں مندرج ہیں۔

پھر اواخر میں قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم

(سورہ انعام آیت ۱۵۱)

سے تین آیتوں تک یہ بھی مدینہ میں نازل ہوئی تھیں جس کے متعلق حافظ سیوطی کا قول ہے قد صح النقل عن ابن عباس باستثناء قل تعالوا الآیات الثلث۔لیکن اس کے بعد بارہ آیتیں پھر مکہ کی نازل شدہ ہیں۔

(۲) اعراف

مکی سورہ ہے مگر وسألھم عن القریة التی کانت حاضرة البحر (سورہ اعراف آیت ۱۶۳) دس آیتوں تک مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔

(۳) انفال

مدنی سورہ ہے مگر یاایھا النبی حسبك اللہ ومن اتبعك من المومنین (سورہ انفال آیت

۶۴) مکہ میں نازل ہوا ہے۔

(۴) ھود

مکی ہے لیکن تین آیتیں مدنی ہیں۔

(۱) فلعلك تارك۔ (سورہ ھود آیت ۱۲)

(۲) افمن كان على بينة من ربه۔ (سورہ ھود آیت ۱۷)

(۳) اقم الصلوٰة طرفی النہار۔ (سورہ ھود آیت ۱۱۴)

(۵) رعد

اس میں یہ آیت ولا یزال الذین کفروا تصیبهم بما صنعوا قارعة

(سورہ رعد آیت ۳۱)

یقیناً مکی ہے اور اللہ یعلم کی آیت شدید المحال تک مدنی ہے اور باقی میں اختلاف ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں۔

(۶) ابراہیم

پورا سورہ مکی ہے لیکن الم تر الی الّذین بدّلوا نعمة الله کفرا

(سورہ ابراہیم آیت ۲۸)

سے لے کر فبئس القرار تک دو آیتیں مدینہ کی نازل شدہ ہے۔

(۷) حجر

مکی سورہ ہے لیکن آیۂ ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستاخرین

(سورہ حجر آیت ۲۴)

کا بلحاظ اس کے شان نزول کے مدینہ میں نازل ہونا یقینی ہے۔

(۸) اسراء

مکی ہے لیکن حسب ذیل آیات مدینہ کے نازل شدہ ہیں۔

(۱) یسألونك عن الروح (سورہ اسراء آیت ۸۵)

(۲)وان کادوا لیفتنونك (سورہ اسراء آیت ۷۳)

(۳)قل لئن اجتمعت الانس والجن (سورہ اسراء آیت ۸۸)

(۴)وما جعلنا الرویا (سورہ اسراء آیت ۶۰)

(۵)ان الذین اوتوا العلم من قبله (سورہ اسراء آیت ۱۰۷)

(۹) کہف

ابتدا کی آٹھ آیتیں اور آخر کی چار مدنی ہیں اور درمیان میں مکی لیکن اس میں بھی واصبر نفسك الخ مدینہ کی نازل شدہ ہے۔

(۱۰) مریم

مکی ہے لیکن آیہ سجدہ اور ان منکم الا واردھا (سورہ مریم آیت ۷۱) والی آیت اس کے خلاف ہے۔

(۱۱) طہٰ

مکی سورہ ہے لیکن آیۂ فاصبر علی ما یقولون الخ (سورہ طہٰ آیت ۱۳۰) متفقہ طور پر اس سے خارج سمجھی گئی ہے۔ اور علامۂ سیوطی کے خیال میں ایک آیت کو اور مستثنیٰ ہونا چاہیے اور وہ یہ ہے، لا تمدّنّ عینیك الی ما متّعنا به ازواجا منهم الخ (سورہ طہٰ آیت ۱۳۱) اس لئے کہ یہ اپنے شان نزول کی بناء پر مدینہ کی نازل شدہ ہے۔

(۱۲) انبیاء

مکی ہے مگر صرف یہ آیت افلا یرون انّا ناتی الارض الخ (سورہ ابنیاء آیت ۴۴) مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

(۱۳) حج

مکی سورہ ہے جس میں ھذان خصمان سے لے کر تین آیتوں تک مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔

(۱۴) مومنون

حتّٰی اذا اخذنا مترفیھا سے لے کر مبلسون تک جو چودہ آیتیں ہیں وہ تو مدینہ کی نازل شدہ ہیں باقی سورہ مکی ہے۔

(۱۵) فرقان

والذین لا یدعون سے رحیما تک جو تین آیتیں ہیں مدنی اور باقی سورہ مکی ہے۔

(۱۶)قصص

مکی سورہ ہے جس میں الذین اٰتینا ھم الکتاب سے لا نبتغی الجاھلین تک جو چار آیتیں ہیں دو مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔

اخرج الطبرانی عن ابن عباس انّھا نزلت ھی واٰخر الحدید فی اصحاب النجاشی الذین قدموا وشھدوا وقعۃ الاحد۔

''طبرانی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ یہ اور سورۂ حدید کا آخر یہ پانچوں آیتیں نجاشی کے ساتھ والوں کے بارے میں نازل ہوئی تھیں جو آکر جنگ احد میں شریک ہوئے تھے۔''(۱)

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سورۂ حدید کا آخری حصہ ان چار آیتوں کے ساتھ ساتھ اترا تھا حالانکہ اب ان کے درمیان ربع قرآن سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔

(۱۷)عنکبوت

شروع کی دس آیتیں مدینہ کی نازل شدہ اور اس کے بعد سے بقیہ حصّہ مکی ہے۔

(۱۸)لقمان

مکی سورہ ہے جس میں لو انّ ما فی الارض من شجرۃ اقلام (سورہ لقمان آیت ۲۷) سے لے کر تین آیتوں تک مدنی ہیں۔

(۱۹)سجدہ

اس میں افمن کان مومنا سے تین آیتوں تک مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور بقیہ حصہ مکی لیکن اس میں بھی تتجا فی جنوبھم والی آیت شان نزول کی بناء پر مدینہ کی نازل شدہ ہے۔

(۲۰)یٰس

مکی سورہ ہے اس میں انا نحن نحیی الموتی و نکتب ما قدموا واثارھم الخ (سورہ یس آیت ۱۲) مدینہ کا نازل شدہ ہے۔

(۲۱)زمر

قل یا عبادی سے لے کر تین آیتوں تک مدینہ کا نازل شدہ اور بقیہ حصہ مکی ہے۔

(۲۲) مومن

مکی سورہ ہے جس میں انَّ الَّذین یجادلون سے دو آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

(۲۳) شوریٰ

ام یقولون افتری علی اللہ کذبا (سورہ شوریٰ آیت ۲۴) سے چار آیتوں تک مدینہ کی نازل شدہ اور اس کے قبل وبعد کی آیتیں مکی ہیں۔

(۲۴) زخرف

مکی سورہ ہے لیکن وسال من ارسلنا الخ (سورہ زخرف آیت ۴۵) اس سے خارج ہے۔

(۲۵) جاثیہ

مکی ہے اور اس میں قل للّذین آمنوا والی آیت مدنی ہے۔

(۲۶) احقاف

مکی ہے لیکن اس میں قل ارایتم ان کان من عند اللہ الخ (سورہ احقاف آیت ۱۰) خبر صحیح کی بناء پر مدینہ کی نازل شدہ ہے۔

(۲۷) ق

مکی سورہ ہے لیکن ولقد خلقنا السموات والارض (سورہ ق آیت ۳۸) والی آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

(۲۸) نجم

مکی ہے جس میں الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش (سورہ نجم آیت ۳۲) والی آیت مدینہ کی ہے۔

(۲۹) رحمن

سورۂ رحمن مکیہ ہے مگر یسأله من فی السموات والارض الخ (سورہ رحمن آیت ۲۹) کی آیت مدینہ میں نازل شدہ ہے۔

ا۔ اتقان، ص ۱۶

(۳۰)واقعہ

مکی ہے لیکن دو مقام اس کے مدنی ہیں۔

(۱)ثلۃ من الاولین وثلۃ من الاخرین (سورہ واقعہ آیت ۳۹، ۴۰)

(۲)فلا اقسم بمواقع النجوم (سورہ واقعہ آیت ۷۵) سے لے کر آٹھ آیتوں تک۔

(۳۱)مجادلہ

مکی سورہ ہے لیکن مایکون من نجوی ثلثۃ الخ (سورہ مجادلہ آیت ۷) مدنی ہے۔

(۳۲)تحریم

شروع سے دس آیتیں مدنی اور باقی مکی ہیں۔

(۳۳)ن والقلم

اس میں انا بلوناھم سے سترہ آیتوں تک اور پھر فاصبر لحکم ربك سے تین آیتوں تک مدنی ہیں اور باقی ۳۲ آیتیں مکی۔

(۳۴)دہر

مکی سورہ ہے مگر فاالصبر لحکم ربك مدینہ کی نازل شدہ ہے۔

(۳۵)مرسلات

مکی ہے لیکن اذا قیل لھم ارکعوا لایر کعون (سورہ مرسلات آیت ۴۸) اس سے خارج ہے۔

اس کے علاوہ بھی مختلف سوروں میں اختلافی اقوال کی بناء پر خلط و آمیزش موجود ہے جن کو متفقہ حیثیت سے ثبوت بہم نہ پہونچنے کی وجہ سے ہم نے ترک کر دیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔(۱)

کیا اس کے بعد یہ امر قابل شک وشبہہ ہے کہ ترتیب آیات میں سلسلۂ تنزیل کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا تھا اور آیات کو بغیر لحاظ تقدیم وتاخیر کے درج کر دیا گیا ہے۔

(دوسرا ثبوت)

قرآن مجید میں عدۂ وفات کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

۱۔ اتقان سیوطی، ج ۱، ص ۱۵-۱۷

والّذین یتوفّون منکم ویذرون

تم (مسلمانوں)میں سے جن لوگوں کا انتقال ہوجائے

ازواجا وصیّۃ لازواجھم متاعا

اور ان کی بیویاں موجود ہوں تو ان کی بیویوں کے لئے

الی الحول غیر اخراج فان خرجن

حکم ہے کہ سال بھر تک نان و نفقہ سے اور وہ

فلا جناح علیکم فی ما فعلن فی

گھروں سے نہ نکلیں پھر جب (سال گذرنے پر)

انفسھن من معروف واللہ عزیز حکیم

(سورہ بقرہ آیت ۲۴۰)

وہ نکلیں تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں طرز عمل اختیار کریں تمہیں کوئی کام اس سے نہ ہوگا اور خدا غالب وحکیم ہے۔

اس آیت میں ازواج کے لئے ایک سال تک عدہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن باجماع امت یہ حکم اس آیت سے منسوخ ہے کہ

والّذین یتوفون منکم ویذرون

تم (مسلمانوں) میں سے جن لوگوں کا انتقال ہو

ازواجا یتربّصن بانفسھن اربعۃ

اوران کی بیویاں موجود ہوں تو وہ چار مہینہ دس

اشھر وعشر افاذا بلغن اجلھن

دن تک اپنے تئیں روکے رکھیں جب وہ اس

فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن

مدت کو پورا کرلیں تو پھر جو کچھ وہ اپنے بارے

بالمعروف واللہ بما تعلمون خبیر

(سورہ بقرہ آیت ۲۳۴)

میں طرز عمل اختیار کریں تمہیں تعرض کا حق نہ ہوگا اور خدا تمہارے اعمال پر مطلع ہے۔

اس آیت میں پہلے حکم کو منسوخ کرتے ہوئے عدّہ کی میعاد چار مہینہ دس دن قرار دی گئی ہے اور یہی حکم وہ ہے کہ جو مسلمانوں میں معمول بہ ہے۔

نسخ کے لغوی واصطلاحی دونوں معنی کی بناء پر ناسخ ومنسوخ میں ترتب فطری ہے یعنی یہ کہ منسوخ پہلے اور ناسخ بعد ہو لیکن مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں صورت حال اس کے بالکل برعکس نظر آتی ہے یعنی قرآن مجید میں دوسری آیت پہلے اور پہلی آیت بعد ہے۔ دوسری دوسرے پارہ کے چودھویں رکوع میں اور پہلی اس کے بعد پندرہویں رکوع میں ہے۔

کیا نظم قرآن کے بترتیب نزول ہونے میں یہ صورت ہوسکتی تھی؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ یقینی طور پر اس امر کی دلیل ہے کہ جمع قرآن کو ترتیب نزول سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(تیسرا ثبوت)

خود قرآن مجید کے آیات میں عمیق نظر ڈالنے سے یہ بے ترتیبی نمایاں صورت سے ظاہر ہوجاتی ہے جس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

پہلی مثال

سورۂ انفال کے ابتداء میں جنگ بدر کا قصہ حسب ذیل الفاظ میں شروع کیا گیا ہے۔

کما اخرجك ربّك من بیتك بالحق وانّ فریقا من المومنین لکارھون یجادلونك فی الحق بعد ما تبیّن کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون و اذیعد کم اللہ احدی الطائفتین انّھا لکم وتودّون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان یحقّ الحقّ بکلماته ویقطع دابر الکافرین۔

(سورہ انفال آیت ۵ تا ۷)

اسی صورت پر جس طرح پروردگار نے تمہیں بالکل ٹھیک (مصلحت سے) تمہارے گھر سے (جنگ

بدر) میں نکالا تھا اور مومنین کا ایک گروہ اس سے ناخوش تھا، وہ لوگ حق ظاہر ہونے کے بعد بھی تم سے سچی بات میں جھگڑتے تھے گویا وہ زبردستی موت کے منھ میں ڈھکیلے جارہے ہیں اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور (یہ وہ وقت تھا) جب خدا تم سے وعدہ کررہا تھا کہ (کفار مکہ کی) دو جماعتوں میں سے ایک تمہارے لئے ضروری ہے اور تم یہ چاہتے تھے کہ کمزور جماعت تمہارے ہاتھ لگے اور خدا یہ چاہتا تھا کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ ڈالے۔

اور بالکل اسی سیاق میں مسلمانوں کی پریشانی اور خدا سے فریاد اور ملائکہ کا نصرت پر مامور ہو کے اترنا ان تمام واقعات کو بیان کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ آیات جنگ بدر کے بعد نازل ہوئے ہیں لیکن اسی کے بعد یہ آیت ہے۔

یاایّھا الّذین آمنوا اذا لقیتم الّذین کفروا زحفا فلاتولّو ھم الادبار ومن یولّھم یومئذ دبرہ الا متحرّفا لقتال او متحیزا الی فئۃ فقد باء بغضب من اللہ و ماوٰہ جھنّم وبئس المصیر۔

(سورہ انفال آیت ۱۵،۱۶)

اے ایمان لانے والو جب کفار سے جنگ میں مقابلہ ہو تو پشت نہ پھرانا اور جو اس دن اپنی پشت پھرائیگا سوا اس کے کہ جنگ کے واسطے کترائے یا کسی جماعت کے پاس جانے کے لئے ہٹے تو وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم میں ہے اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔

یہ تہدیدی آیت یقینا جنگ کے قبل کی ہے اور اس کو جنگ ختم ہونے کے بعد والے آیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کے بعد پھر ایک مرتبہ سلسلہ قبل والے سیاق سے مل جاتا ہے کہ

فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔

(سورہ انفال آیت ۱۷)

تم نے (اے مسلمانو) انھیں قتل نہیں کیا بلکہ ہم نے قتل کیا اور تم نے (اے رسول) ان کی طرف سنگریزے نہیں پھینکے بلکہ خدا نے پھینکے ہیں۔

یہ بھی جنگ کے بعد کی آیت ہے جو جنگ کے انجام کو قصۂ ماضی کی صورت میں بیان کر رہی ہے۔ پھر غیر متعلقہ آیات کے بعد جنہیں اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں سورہ کے اواخر میں یہ آیت نظر آتی ہے۔

یا ایھا النبّی حرّض المومنین علی القتال ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین وان یکن منکم مائۃ یغلبوا الفامن الّذین کفروا بانھم قوم لا یفقھون۔

(سورہ انفال آیت ۶۵)

اے پیغمبر تم مومنین کو جنگ پر آمادہ کرو (کہو کہ) اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم ہوں تو انھیں دو سو پر غالب آنا چاہیئے اور اگر سو ہوں تو وہ ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں اس لئے کہ وہ لوگ ناسمجھ ہیں۔

قال الحسن ان التغلیظ کان علی اھل بدر ثم جاءت الرخصۃ۔

حسن نے کہا ہے کہ ''یہ سخت حکم اہل بدر کے لئے تھا'' پھر اس حکم کو آسان کر دیا گیا۔''

اس بناء پر یہ آیت جنگ بدر کے پہلے اور دوسری آیت جس میں اس حکم کو منسوخ کیا گیا ہے وہ اس کے بعد نازل ہوئی ہے، ناسخ و منسوخ دونوں آیتوں کا ایک ساتھ ہونا آئین نسخ کے خلاف ہے لیکن قرآن مجید میں یہ دونوں آیتیں حالات جنگ بدر کے بعد پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔

دوسری مثال

سورۂ عنکبوت میں ابراہیم خلیل الرحمن کا تذکرہ اس طرح شروع ہوا ہے۔

وابراھیم اذ قال لقومه اعبدوا الله واتقوہ (سورہ عنکبوت آیت ۱۶) یہاں سے لے کر دو آیتوں تک قصۂ ابراہیم سے متعلق ہیں جن میں ابراہیم کی گفتگو اپنی قوم سے نقل کی گئی ہے۔ کہ ابراہیم نے کہا۔

''خدا کی عبادت کرو اور اس سے ڈرتے رہو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ تم خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے ہو اور جھوٹی باتیں بناتے ہو یہ کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو تمہاری روزی پر اختیار نہیں رکھتے تو پھر تم خدا ہی سے روزی مانگو اور اسی کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو اور اسی کی طرف تم پلٹ کر جاؤ گے۔''

اس کے بعد دیکھنے والے کی نظر صبر آزما جستجو رکھتی ہوگی کہ اس کا جواب قوم ابراہیم نے کیا دیا لیکن قرآن مجید میں یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ اس کے بعد چھ آیتیں بالکل غیر متعلقہ ہیں جن کو اس قصہ سے کوئی تعلق نہیں

اوراس کے بعد یہ آیت ہے کہ فما کان جواب قومه الاّ ان قالوا اقتلوه او حرّقوه الخ (سورہ عنکبوت آیت ۲۴) کہ جس کو لفظی و معنوی اتصال پہلی دونوں آیتوں کے ساتھ ہے اوراس میں قوم کا جواب ابراہیم کو فائے تفریع کے ساتھ نقل کیا ہے جو اسکے ارتباط کا پہلی آیتوں سے ضامن ہے لیکن افسوس کہ موجودہ صورت جمع وتدوین نے اس اتصال کو افتراق سے بدل کر قرآن کی بلاغت کو دھچکا پہونچادیا۔

تیسری مثال

سورۂ لقمان میں لقمان کے نصائح ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

واذقال لقمان لابنه وهو يعظه يابنيّ لا تشرك بالله ان الشرك لظلم عظيم۔

(سورہ لقمان آیت ۱۳)

(وہ وقت یاد کرو) جب لقمان نے اپنے بیٹے سے اس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا خبردار کسی کو خدا کا شریک نہ بنانا اس لئے کہ شرک یقینا بڑا سخت گناہ ہے۔

یا بنیّ انها ان تك مثقال حبة من خردل فتكن فی صخرة او فی السموات والارض یات بها الله ان الله لطیف خبیر۔

(سورہ لقمان آیت ۱۶)

بیٹا اس میں شک نہیں کہ عمل اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو اور وہ کسی سخت پتھر کے اندر یا آسمانوں یا زمینوں میں ہو تب بھی اس کو حساب کے لئے خدا سامنے لے آئیگا اور خدا بڑا باریک بیں واقف کار ہے۔

یہ دونوں آیتیں دست وگریبان ہیں اور جس طرح بعد کی آیتیں وصایائے لقمان میں بالکل سلسلہ وار ہیں اسی طرح معنوی ارتباط کی بناء پر یہ دونوں آیتیں بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں لیکن صورت یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان میں دو آیتیں بالکل غیر متعلق موجود ہیں۔

ووصينا الانسان بوالديه حملته امه و هنا علی وهن الخ ۔ (سورہ لقمان آیت ۱۴) جو نہ وصایائے لقمانی میں داخل ہیں اور نہ لقمان کا کلام اور نہ قصہ لقمان سے وہ کوئی ربط رکھتی ہیں۔

پھر جب اس مقام پر یہ نمونہ واضح طور پر موجود ہے کہ ایسی دو آیتوں کے درمیان میں جو ایک کلام کی

جزو اور ایک سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں غیر متعلق آیتوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس نے واقعہ کی بے ساختگی اور کلام کے تسلسل اور بیان کے ارتباط کو غیر معمولی صدمہ پہونچا دیا ہے تو پھر کیوں نہ اسی نوعیت کی۔

چوتھی مثال

اس کو سمجھ لیا جائے کہ سورۂ احزاب میں ازواج نبی کی متعلقہ آیتوں میں جن میں صریحی طور سے یانساء النبی کہہ کر ان کو مخاطب کیا گیا ہے ایک غیر متعلقہ آیت درج کر دی گئی ہے جو لفظ و معنی دونوں کے اعتبار سے ازواج والی آیتوں سے مغایرت رکھتی ہے۔ یعنی ''انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا'' (سورہ احزاب آیت ۳۳) خصوصاً جبکہ مستند آثار واحادیث کے رو سے اس کا خاص وقت پر مخصوص اشخاص کے متعلق نازل ہونا بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے جس میں ازواج کا کوئی حصہ نہیں۔

ان تمام امثلہ و نظائر اور ان کے قبل مذکور ہونے والے ادلہ و شواہد کی بناء پر یہ امر یقینی ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے جمع و تالیف میں باعتبار شان نزول کے تقدیم و تاخیر اور تفرق و انتشار پایا جاتا ہے اور وہ اصلی صورت تنزیل سے کوسوں دور ہے۔

خوش عقیدہ حضرات اس اندھا دھند کی ذمہ داری خدا اور سول پر عائد کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ قرآن مجید کا نزول غیر مرتب صورت سے تھا اور حسب موقع متفرق طور پر آیات نازل ہوتے تھے۔ بعد میں رسالتمآبؐ جبرئیلؑ امین کی ہدایت سے ان آیات کو مختلف سوروں پر تقسیم فرما دیتے تھے کہ یہ آیت اس سورہ سے متعلق ہے اور یہ آیت اس دوسرے سورہ سے۔

اور اس طرح یہ صورت کہ جس پر موجودہ قرآن کی ترتیب ہوئی ہے لوح محفوظ والے مرتب قرآن سے مطابق ہے۔

اور اس کے ثبوت میں متعدد روایات کا حوالہ دیا جاتا ہے جن کو علامہ سیوطی نے اتقان ج ۱، ص ۶۲، ۶۳ میں درج کیا ہے۔

(۱) زید بن ثابت کی روایت کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع ہم لوگ جناب رسالتمآبؐ کی خدمت میں قرآن مجید کو مختلف پرزوں سے جمع کیا کرتے تھے۔

جس کو حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس روایت سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ وہ جمع وتالیف ترتیب نزول کے خلاف تھی۔

(۲) وہ حدیث جس کو احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان، حاکم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے عثمان سے کہا ''یہ تم لوگوں کو کیا ہوگیا تھا کہ تم نے انفال کو جو مثانی سے ہے اور برأت کو جو سورمئین سے ہے قرآن میں ملا کر لکھ دیا اور اس کے درمیان میں بسم اللہ بھی نہیں لکھی اور پھر ان دونوں کو سبع طوال میں درج کر دیا۔''

حضرت عثمان نے جواب دیا کہ ''جناب رسالتمآبؐ پر مخصوص تعداد کے سورے نازل ہوا کرتے تھے تو جب کوئی آیت اترتی تھی آپ اپنے کاتبان وحی میں سے کسی کو بلا کر فرماتے تھے کہ ان آیات کو اس سورہ میں درج کردو جس میں ایسا ایسا مضمون ہے اور انفال ان ابتدائی سوروں میں سے ہے جو مدینہ میں نازل ہوئے تھے اور برأت سب سے آخر میں اترا تھا اور اس میں جو واقعہ مذکور ہے وہ پہلے سورہ کے مضمون سے ملتا جلتا ہوا ہے اس بناء پر مجھے گمان ہوا کہ یہ اسی پہلے سورہ کا جزو ہے۔ اس کے بعد جناب رسالتمآبؐ کا انتقال ہوگیا اور حضرت نے ہم کو نہیں بتلایا کہ یہ حقیقتہً اس سورہ کا جزو ہے لہٰذا میں نے اِن دونوں کو ملا کر لکھ دیا اور بسم اللہ ان دونوں کی درمیان درج نہیں کی اور اس کو سبع طوال میں داخل کر دیا۔''

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کسی آیت کے مقام کو تعیین کے ساتھ نہیں بتلاتے تھے۔ بلکہ یہ فرماتے تھے کہ جس سورہ میں ایسا ایسا مضمون مذکور ہے وہاں درج کردو۔ یعنی آیات کی ترتیب میں مضمون کی مناسبت کا لحاظ ضروری تھا۔ اب ان آیات کو کیا کہا جائے جو مضمون کے اعتبار سے بے جوڑ ہونے کے باوجود پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور ایک مسلسل واقعہ کے بیچوں بیچ غیر متعلقہ آیات نظر آتی ہیں کیا اس کے ذمہ داری ان کاتبان وحی کے سر ہے جن کو رسالتمآبؐ اس امر کا ذمہ دار بنائے ہوئے تھے یا کسی اور پر؟

(۳) وہ حدیث جس کو امام احمد نے عثمان بن ابی العاص سے نقل کیا ہے کہ میں حضرت رسولؐ کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ ایک مرتبہ آپ نے نظر جما کر دیکھا اور پھر نظر بلند کی اور فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل آئے تھے اور انھوں نے ہدایت کی ہے کہ میں اس آیت کو اس سورہ میں اس جگہ پر رکھ دوں اور وہ آیت یہ ہے

''ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتآء ذی القربیٰ الخ''۔ (سورہ نحل آیت ۹۰)

(۴) بخاری نے ابن زبیر کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت عثمان سے کہا و الّذین یتو فّون منکم ویذرون ازواجاً (سورہ بقرہ آیت ۲۴۰) والی آیت کو دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے پھر آپ اس کو لکھتے اور اس کو ترک کیوں کرتے ہیں؟ حضرت عثمان نے کہا یا ابن اخی لا اغیر شیئا منه من مکانه فرزند برادر میں اس میں سے کسی چیز کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹاؤں گا۔"

اس سے حافظ سیوطی نے یہ مطلب نکالنا چاہا ہے کہ وہ بالکل حضرت رسولؐ کی قرارداد کے پابند تھے اور جو آیت جس جگہ رکھ دی گئی تھی اس سے ہٹانا منظور نہ تھا۔

لیکن درحقیقت یہ مطلب ان الفاظ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ بات یہ ہے کہ حضرت عثمان نے اختلافات سے عاجز آ کر تمام لوگوں کو ایک قرآن کا پابند بنانے کے لئے زید بن ثابت کے جمع کردہ قرآن کے سوا دوسرے صحابہ کے مصاحف کو نذر آتش کرا دیا تھا اور اس قرآن کے سات نسخے لکھوا کر تمام عالم اسلام کے اطراف میں روانہ کر دیئے تھے جس کے تفاصیل کے لئے آیندہ کا انتظار کرنا چاہئے تو ابن زبیر کی اس خوردہ گیری پر انھوں نے جواب دیا کہ اب میں اس کے ایک حرف کو بھی اس کی جگہ سے نہ ہٹاؤں گا کیونکہ اس سے میری محنت اکارت ہو جائے گی۔

ان الفاظ کو ترتیب آیات کے توقیفی ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۵) صحیح مسلم کی حدیث حضرت عمر سے کہ میں برابر رسالتمآبؐ سے کلالہ کے معنی پوچھا کرتا تھا آخر حضرت نے (غصہ سے) اپنی انگلی میرے سینہ میں بھونک کر ارشاد فرمایا:

تکفیك اٰیة الصیف التی فی آخر سورة النسآء۔

"تمہارے لئے کافی ہے سورۂ نساء کے آخر والی آیت"

(٦) وہ احادیث جن میں مختلف سوروں کا نام لے کر ان کے ابتداء یا انتہاء کے آیات کی تلاوت کا ثواب بیان کیا گیا ہے یا مختلف نمازوں میں رسالتمآبؐ کا ان سوروں کو پڑھنا نقل ہوا ہے۔

لیکن درحقیقت اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ قرآن مجید جناب رسالتمآبؐ کے وقت ہی میں اور نزول کے زمانہ ہی سے سوروں کی صورت میں منقسم تھا اور ان سوروں کے اسماء بھی تھے اور ان کے آیات بھی جداگانہ تھے جس کا ثبوت ان تمام احادیث سے ہوتا ہے کہ جن میں جناب رسالتمآبؐ نے خاص خاص سوروں

کا حوالہ دے کر بعض احکام بیان فرمائے ہیں مگر تنقیح طلب یہ مسئلہ ہے کہ ان سوروں کی ترتیب کیا موجودہ ترتیب کے مطابق تھی جس میں اول کی آیت آخر اور آخر کی آیت اول میں ہے یا کچھ اور؟ اس سوال کا جواب مذکورۂ بالا احادیث میں سے کسی سے بھی نہیں نکلتا بلکہ اس کے برخلاف اعلم التابعین سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حَبر الامۃ ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یعرف ختم السورۃ حتی ینزل علیہ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

''حضرت رسول کو اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ سورہ ختم ہو گیا جس وقت بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل ہوتی تھی۔''

دوسری روایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے کنا لا نعلم فصل ما بین السورتین حتیٰ ینزل بسم اللہ الرحمن الرّحیم۔

''ہم کو دو سوروں کا فاصلہ معلوم نہ ہوتا تھا جب تک کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم'' نازل نہ ہوتی تھی۔

ان دونوں روایتوں کو مشہور و مسلم الثبوت مفسر امام واحدی نے کتاب اسباب النزول (طبع مصر، ص ۱۱) میں درج کیا ہے اور ان دونوں روایتوں سے صاف ظاہر ہے کہ ایک بسم اللہ نازل ہونے کے بعد دوسری بسم اللہ نازل ہونے تک جو کچھ اترتا تھا وہ ایک سورہ سمجھا جاتا تھا اور اس بسم اللہ سے لے کر تیسری بسم اللہ کے اترنے تک تیسرا سورہ اور علی ہذا القیاس۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات کی ترتیب اور سوروں کا انقسام براہ راست سلسلۂ تنزیل کے مطابق تھا اور اس میں کسی الٹ پھیر کو دخل نہ تھا اور موجودہ ترتیب کو کوئی تعلق سور و آیات کی مقرر شدہ ترتیب کے ساتھ نہیں ہے۔

اور پھر جبکہ مستند محدثین کے محررات میں ایسے روایات پائے بھی جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ جمع و تدوین کے سلسلہ میں کسی توقیف و قرارداد کی پابندی اختیار نہ کی گئی تھی چنانچہ حافظ سیوطی نقل کرتے ہیں۔ اخرج ابوداؤد فی المصاحف من طریق محمد بن اسحق عن یحییٰ بن عباد عن عبداللہ بن الزبیر عن ابیہ قال اتّی الحارث بن خزیمۃ بھا تین الاٰیتین من آخر سورہ براۃ فقال اشھد أنّی سمعتھما من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووعیتھما فقال عمر وانا اشھد لقد سمعتھما ثم قال لو کانت ثلث آیات لجعلتھا سورۃ علی حدۃ

فانظروا آخر سورۃ من القرآن فالحقوھا فی آخرھا۔

مشہور حافظ حدیث ابن ابی داؤد نے باسناد خود زبیر بن العوام سے روایت کی ہے کہ حارث بن خزیمہ موجودہ سورۂ برأت کی دونوں آخری آیتیں (لقد جاء کم رسول الخ) لے کر آئے اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسالتمآبؐ کو انھیں پڑھتے ہوئے سنا ہے اور یاد کیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ان دونوں آیتوں کو حضرت کی زبان سے سنا ہے۔ پھر حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر یہ تین آیتیں بھی ہوتیں تو میں انھیں مستقل سورہ قرار دے دیتا اب کسی سورہ کے آخر میں دیکھ کر ان کو اس میں ملحق کردو۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر اس روایت کی وجہ سے بڑے شش و پنج میں پڑ گئے ہیں اور سیوطی نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:۔

یعارضه ما اخرجه ابن ابی داؤد ایضا من طریق ابی العالیة عن ابی بن کعب انهم جمعوا القرآن فلمّا انتهوا الیٰ الایة التی فی سورة برائة ثم انصرفوا صرف الله قلوبهم بانهم قوم لا یفقهون ظنوا ان هذا آخر ما انزل فقال ابی ان رسول الله صلی الله علیه وسلم اقرأنی بعد هذا ایتین لقد جاء کم رسول الی آخر السورة۔

''اس حدیث کے معارض ہے وہ جس کو خود ابن ابی داؤد نے ابو العالیہ کے طریق سے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ صحابۂ کرام نے قرآن جمع کیا تو جب اس آیت تک پہونچے جو سورۂ برأت میں ہے کہ ''ثم انصرفوا صرف الله قلوبهم بانهم قوم لا یفقهون'' (سورہ توبہ آیت ١٢٧) تو خیال ہوا کہ یہ سب سے آخری آیت ہے جو رسالت مآبؐ پر نازل ہوئی تھی، ابی نے کہا مجھ کو رسالتمآبؐ نے اس کے بعد دو آیتیں اور یاد کرائی تھیں کہ لقد جاء کم رسول الخ''۔

لیکن افسوس ہے کہ جب اس حدیث کے متن پر نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ ایسی کمزوریوں پر مشتمل ہے جن کی بنا پر وہ خود اپنے صحت و اعتبار کو سنبھال نہیں سکتا۔ دوسری روایت سے معارضہ کر سکنا کیا معنی رکھتا ہے؟

پہلے تو تمام صحابہ کا یہ خیال کرنا کہ ''ثم انصرفوا صرف الله قلوبهم '' والی آیت بالکل آخری ہے اور ابی کا صرف اس امر کو ظاہر کرنا کہ اس کے بعد دو آیتیں اور ہیں اس امر کا صاف مظہر ہے کہ ان

دونوں آیتوں میں ابی بن کعب متفرد تھے پھر صرف ان کی گواہی پر یہ دونوں آیتیں قرآن میں درج کیونکر ہوگئیں جبکہ مقررہ اصول کے مطابق جب تک دو گواہ موجود نہ ہوتے کسی آیت کو درج قرآن نہ کیا جاتا تھا یہاں تک کہ اس معاملہ میں حضرت عمر کی شخصیت کا لحاظ نہ کیا گیا اور ان کی گواہی کو اس بناء پر مسترد کر دیا گیا کہ وہ اپنی گواہی میں تنہا تھے اور کوئی ان کے ساتھ نہ تھا۔

اور پھر بقول ان حضرات کے زید بن ثابت صاحب عرضۂ اخیرہ تھے یعنی آخری مرتبہ جو جبرئیل امین کے ساتھ قرآن کا مقابلہ ہوا تھا اس میں یہ حاضر تھے اور ابی بن کعب بیچارے اس شرف سے محروم بلکہ وہ قدیم نازل شدہ قرآن کی تعلیم حاصل کئے ہوئے تھے اور اسی بنا پر جمع قرآن کے لئے ابی کو چھوڑ کر زید بن ثابت کو منتخب کیا گیا تو پھر ایک ایسی آیت جس پر زید مطلع نہ تھے۔ ابی بن کعب کی گواہی پر درج کیونکر کر دی گئی، کیا اس میں یہ شبہہ نہ ہوسکتا تھا کہ وہ منسوخ التلاوۃ ہو اور اسی وجہ سے عرضہ اخیرہ والے زید بن ثابت کے وہ گوش گذار نہ ہوئی۔

اس کے علاوہ ان لوگوں کو اس آیت کے متعلق یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ وہ رسالتمآبؐ پر سب کے بعد نازل ہوئی ہے لیکن ابی بن کعب نے بتلایا کہ نہیں رسالتمآبؐ نے مجھ کو دو آیتیں اور اس کے بعد یاد کرائی ہیں۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابی بن کعب کے نزدیک قرآن کی اصل ترتیب تاریخ نزول کے مطابق تھی ورنہ اس آیت کے بعد دو آیتوں کا یاد کرانا کبھی اس امر کی دلیل نہ ہوتا کہ ان کے قبل والی آیت سلسلۂ تنزیل کے اعتبار سے بھی آخری نہیں ہے۔

"اور پھر جبکہ طریقۂ جمع و تالیف والے احادیث سے درایۃً یہ امر ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ترتیب میں اصلی سلسلۂ ترتیب کا نظم و نسق محفوظ رہا ہو اس لئے کہ زید بن ثابت نے کہ جو جمع قرآن کے ذمہ دار قرار دیئے گئے تھے یہ کہا ہے کہ "کنت اجمعه من الرقاع والعسب واللخاف وصدور الرجال" میں اس کو کاغذ کے پرزوں، درخت کی چھالوں، پتھر کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرتا تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ آیات قرآن مجتمع و منتظم صورت میں موجود ہی نہ تھے اور نہ اس طرح کسی سینہ کے اندر محفوظ تھے۔ پھر اگر حقیقۃً ان آیات کے اندر کوئی ترتیب قائم تھی بھی تو اس ترتیب کی پابندی اس صورت سے جمع و تالیف میں کیونکر ممکن ہے بلکہ فطرۃً لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آخر کا اول اور اول کا آخر ہو جائے اور اس

طرح موجودہ ترتیب کی ذمہ داری کسی طرح خدا اور سول پر عائد نہیں ہوسکتی۔

اگر غور کیا جائے تو ترتیب نزول کو سور و آیات قرآن کی افادی حیثیت میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔فلسفۂ تاریخ کی خبر رکھنے والے اس امر کا اندازہ رکھتے ہیں کہ واقعات کے تسلسل کو ان کی نوعیت سمجھنے میں کتنا بڑا دخل ہوتا ہے اور واقعات کے الٹ پلٹ ہوجانے سے اکثر باتوں کی تہ تک پہونچنے میں کیسی رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں۔

درحقیقت بہت سے اختلافات جو آیات قرآن کے معانی میں پائے جاتے ہیں وہ اسی ترتیب نزول کے برقرار نہ ہونے کا نتیجہ ہیں اسی بناء پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے بڑے راز دار اور مصالح تنزیل کے سب سے زائد باخبر امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ نے اس ضرورت کا احساس کیا اور اس اہم خدمت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے کر قرآن مجید کو نزول کے مطابق جمع فرمایا جس کو علامۂ سیوطی نے اس طرح لکھا ہے کہ ''فمنهم من رتبها على النزول وهو مصحف علی كان اوله اقرأ ثم المدثر ثم ن ثم المزمل ثم تبت ثم التكوير وهكذا الى آخر المكی والمدنی''صحابہ میں سے بعض نے اس کو نزول پر مرتب کیا اور وہ علیؑ کا مصحف ہے جس کی ابتداء اقراء سے اور اس کے بعد مدثر اور پھر قلم اور پھر مزمل پھر تکویر اور اسی صورت پر آخر تک مکی و مدنی سورے ترتیب وار درج ہیں۔(۱)

اور حقیقۃً یہ کام سوائے امیر المومنین کے اور کوئی انجام بھی نہ دے سکتا تھا۔اس لئے کہ عہد رسالتمآبؐ میں قرآن کے آیات جو لکھوائے جاتے تھے وہ کاغذ کے پرزوں اور درخت کی چھالوں اور پتھر کے ٹکڑوں پر جن کا مرتب صورت سے کسی مقام پر محفوظ ہونا ناممکن تھا اور صحابۂ کرام جو قرآن مجید یاد کرتے تھے وہ بھی کسی ترتیب کے ساتھ نہ تھا جس کا اعتراف علامۂ شیخ مصطفی صادق رافعی نے اپنی کتاب اعجاز القرآن میں کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

كان القران مرتّب الايات غير انه لم يكن مجموعا بين دفتين فلا يومن ان يضطرب نسق مجموعه فی ايدی الناس باضطراب القطع التی كتب فيها تقديما

۱۔ اتقان، ج۱، ص ۶۳۔۶۴

وتأخيراولم يلزم الناس القرأة يومئذ بتوالى السوروذلك ان الواحد منهم اذا حفظ سورة او كتبها ثم خرج فى سرية فنزلت سورة اخرىٰ فانه كان اذا رجع يأخذ فى حفظ ما ينزل بعد رجوعه و كتابته و يتتبع ما فاته علىٰ حسب ماتسهل له ا كثره او اقله فمن ثم يقع فيما يكتبه تأخير المقدم وتقديم الموخر۔

''قرآن کے آیات بجائے خودترتیب رکھتے تھےلیکن وہ کسی ایک شیرازہ میں منسلک نہ تھےلہٰذا یہ اطمینان نہ ہوسکتا تھا کہ اس کا نظم ونسق لوگوں کے ہاتھ میں ان ٹکڑوں کے الٹ پلٹ ہوجانے کی وجہ سے جن پر آیات درج تھے بدل نہ جائے گا اور پھراس زمانہ میں لوگ ترتیب کے ساتھ سوروں کے حفظ پر بھی مامور نہ تھے بلکہ صورت یہ تھی کہ ایک شخص ان میں سے جب کوئی سورہ یاد کرتا تھا یااس کو اپنے پاس لکھتا تھا اوراس کے بعداس کوکسی معرکہ جہاد میں جانے کا اتفاق ہوجاتا تھاتواس دوران میں بھی کچھ نہ کچھ آیات قرآن اورسورے نازل ہوتے تھے۔جب وہ صحابہ واپس آتے تھےتواب وہ ان آیات کوجوتازہ نازل ہوتی تھیں یادکرنا اورلکھنا شروع کردیتے تھےاور باقی ماندہ مقدار کوتھوڑاتھوڑااپنے پاس لکھتے جاتے تھے۔اسی وجہ سے ان کے مکتوبہ آیات میں اول کا آخراورآخرکا اول ہوجایا کرتا تھا۔''(۱)

اس طرح ان صحابہ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ قرآن مجید کوسلسلۂ تنزیل کے مطابق یادکریں اور پھر جبکہ ان میں سے کوئی بھی آیات قرآن کے نزول کے موقع پر برابر موجود بھی نہ تھا۔بلکہ ان میں سے اکثر ہجرت کے بعداسلام لانے والے تھےجن کی غیبت میں کثیر حصہ قرآن مجید کا نازل ہوچکا تھااورانھیں اطلاع بھی نہ تھی کہ کون آیت کب اورکس موقع پر نازل ہوئی اس کے لئےتوایک ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جورسالتمآبؐ کے پاس اوائل زمانۂ بعثت سے اس طرح ساتھ رہا ہوجیسے جسم کے لئے سایہ اورسفروحضرت تنہائی میں اورمجمع میں آپ کا ہم نفس رہاہو۔جس کی تعلیم کا بذاتِ خودحضرت کواتنا خیال ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔جس کی تصویر کشی شاگردنے ان الفاظ سے کی ہو''اذا سألت اجابني واذانطقت ابتدانی'جب میں دریافت کرتا تھا توجواب دیتے تھےاورجب میں چپ رہتا تھاتوخودسے مجھ کوتعلیم فرماتے تھے۔

۱۔ اعجاز القرآن،طبع مصر،ص ۴۳

جس کا دعویٰ یہ ہو کہ واللہ ما نزلت اٰیۃ الا وقد علمت فیما نزلت واین نزلت وعلی من نزلت ان ربی وھب لی قلبا عقولا ولسانا ناطقاً خدا کی قسم کوئی آیت نازل نہیں ہوئی مگر یہ کہ میں جانتا ہوں وہ کا ہے میں اور کہاں اور کس کے متعلق نازل ہوئی خدا نے مجھ کو باخبر دل اور گویا زبان عطا کی ہے۔‘‘

یا یہ کہ ’’سلونی عن کتاب اللہ فانہ لیس من ایۃ الا وقد عرفت بلیل نزلت ام بنہار ام فی سھل ام فی جبل‘‘۔ مجھ سے کتاب خدا کے متعلق سوال کرو اس لیے کہ کوئی آیت نہیں مگر یہ کہ میں جانتا ہوں وہ شب کو نازل ہوئی یا دن کو۔ سہل میں یا جبل میں دونوں روایتوں کے لئے ملاحظہ ہو۔(۱) اسی بنا پر حضرت کا اس فرض کو ادا کرنا درحقیقت اسلام کی وہ عظیم خدمت تھی جس کی مسلمان جتنی بھی قدر کرتے کم تھی، اس طرح قرآن خود اپنے مندرجہ حقائق کی ایک مرتب تفسیر ہوتا جس سے نہ معلوم کتنے مشتبہ غوامض حل ہو جاتے۔

اور پھر جبکہ اس فرض کی اہمیت کا اندازہ خود صدر اسلام کے مسلمانوں کو تھا بھی لیکن وہ صورت حال کی بناء پر اس کو غیر ممکن الوقوع سمجھتے تھے جیسا کہ علامہ سیوطی کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن سیرین نے عکرمہ سے پوچھا الّفوہ کما انزل الاول فالاول ’کیا صحابہ نے قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق سلسلہ وار جمع کیا تھا۔‘‘ عکرمہ نے کہا ’’لو اجتمعت الانس والجن علی ان یؤلفوہ ھذا التالیف ما استطاعوا‘‘۔ اس صورت سے تو اگر تمام جن وانس بھی جمع ہوتے قرآن مجید کو جمع نہ کر سکتے تھے‘‘۔(۲) بیشک اس فقرہ کی تعمیمی وسعت میں تنگ نظری و کوتاہ بینی کا عنصر نمایاں ہے۔ گھر کی چار دیواری میں آنکھ کھولنے والا صحرا کی وسعت کا اندازہ نہیں کرتا کال کوٹھری میں پوری زندگی گذار دینے والا اپنی دنیا اسی کال کوٹھری میں محدود سمجھتا ہے۔ اور اسی لئے عکرمہ کو نمایاں نمایاں ہستیوں اور ذمہ دار شخصیتوں کے مبلغ علم پر نظر کر کے یہ حکم لگا دینے کا حق ضرور تھا کہ سمندر انہی اٹھتے ہوئے حبابوں میں منحصر ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ محراب عبادت کے تاریک زاویوں میں اور نخلستان یہود کے درختوں کے پاس مشکیزہ بردوش ایسی ہستی بھی ہو سکتی ہے جس کے سامنے یہ

۱۔ تاریخ الخلفاء سیوطی، ص ۱۸۴ بحوالہ طبقات ابن سعد

۲۔ اتقان، ص ۶۹

مشکل مشکل نہیں ہے وہ رسولؐ کا حقیقی وارث علم جس نے براہ راست معدن وحی وتنزیل سے اسرار تنزیل کو حاصل کر کے گنجینہ کی صورت میں محفوظ کیا ہے اور اس بناء پر اسے حق پہونچتا ہے کہ وہ اسکے حقیقی صورت پر جمع وتالیف کے فرض کو انجام دے۔

اب یہ امر ''امور مملکت خویش'' کے تحت میں شاید زبان کشائی سے بلند وبالا سمجھا جائے کہ پھر آخر جمع قرآن کے موقع پر امیر المومنینؑ کے جمع کردہ مصحف کو کم سے کم لے کر دیکھنے یا آپ کو جمع قرآن کے کام میں شریک کرنے یا بالا بالا کم از کم آپ سے مشورہ لینے ہی کی ضرورت کیوں نہ سمجھی گئی۔

یہ تاریخ کا حیرت انگیز کرشمہ نہیں تو کیا ہے کہ علامہ مصطفی صادق رافعی ''اعجاز القرآن'' میں لکھتے ہیں۔

مما لیس فیه ریب ان منهم قوما جمعوا القرآن کله لذالك العهد وقد اختلفوا فی تعیینهم بیدانهم اجمعوا علی نفر منهم علی بن ابی طالب ومعاذبن جبل وابی بن کعب و زید بن ثابت وعبدالله بن مسعود وهولآء کانوا مادة هذاالامر من بعد فان المصاحف التی اختصت بالثقة کانت ثلثة مصحف ابن مسعود و مصحف ابی و مصحف زید۔

اس میں شبہ نہیں کہ صحابہ میں سے بعض حضرات نے تمام قرآن اسی زمانہ میں جمع کر لیا تھا اور ان لوگوں کی تعیین میں اختلاف ہے لیکن مذکورۂ ذیل اشخاص کے متعلق اجماع ہے علیؑ بن ابی طالب، معاذ بن جبل۔ ابی بن کعب، زید بن ثابت عبداللہ بن مسعود، اور یہی لوگ بعد کے لئے اس امر کے سر چشمہ تھے اس لئے کہ جو مصاحف بعد میں مخصوص طور پر قابل اعتماد سمجھے گئے وہ یہ تین تھے۔ مصحف ابن مسعود، مصحف ابی، مصحف زید۔ (ص ۳۵/۳۶)

اول وآخر کی تطبیق کے بعد نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ باجماع امت علیؑ بن ابی طالبؑ نے قرآن جمع کیا تھا لیکن صحابہ کو اعتماد جو پیدا ہوا وہ ابی بن کعب اور عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت کے جمع کردہ قرآن پر اور بس۔

اب امیر المومنینؑ کے لئے طریق کار دو صورتوں میں منحصر تھا، ایک یہ کہ آپ اپنے جمع کردہ مصحف کو منظر عام پر لا کر اس کی نشر واشاعت میں اپنی پوری کوشش صرف فرماتے اور مسلمانوں کو اس پر عمل کی دعوت

دیتے۔ یہ صورت بے شک مسلمانوں کے لئے ان فوائد سے استفادہ کا موقع پیدا کرتی کہ جو آیات قرآن کے سلسلہ نزول کے ساتھ مرتب ہونے میں حاصل ہو سکتے ہیں لیکن اس سے اسلام کی ہیئت اجتماعیہ کو ایک عظیم صدمہ پہونچتا یعنی ان کے لئے ایک قرآن کے بجائے دو قرآن ہو جاتے جو اقوام عالم میں اسلام کی عظمت و روحانیت کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتا تھا۔ اور پھر اس کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ ابی بن کعب و عبداللہ بن مسعود وغیرہ والے مصحفوں کے ساتھ تیسرے دور میں وہ بھی نذر آتش نہ کر دیا جاتا۔

(۲) دوسرے یہ کہ آپ باوجود اختلاف مسلک کے مفاد اسلامی کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے مرتب کردہ قرآن کو اپنے پاس محفوظ رکھ کر عملی طور سے اسی صورت کو تسلیم کر لیں۔ جس کو مسلمانوں کے ذمہ دار افراد نے اپنی صوابدید سے تجویز کر لیا تھا اور اپنے متبعین کو اسی پر عمل کی دعوت دیں۔ اس طرح امیر المومنینؑ کی ذاتی حیثیت سے اگر چہ ایک حد تک شکست سمجھی جا سکتی ہے یعنی یہ کہ ان کا مرتب کردہ قرآن مقبولیت عامہ کے درجہ کو حاصل نہ کر سکا بلکہ خود آپ کو دوسروں کی صوابدید کا پابند ہونا پڑا لیکن انھوں نے مفاد اسلامی کی خاطر کبھی اپنے ذاتی مفاد کا لحاظ نہیں کیا۔

انھوں نے اسی اسلامی شیرازہ کی نگہداشت کے لئے اپنے حق کو حاصل کرنے میں زبانی احتجاج پر اکتفا کرتے ہوئے کبھی عملی اقدام نہیں کیا۔ انھوں نے اسی کی خاطر ستائیس برس تک خانہ نشینی گوارا کی اور مقابلہ کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

انجام بین اور عاقبت اندیش حافظ اسلام نے ان دونوں صورتوں کا موازنہ کیا اور پہلی صورت کو دوسری صورت سے زیادہ خطرناک پایا۔ بیشک اگر موجودہ قرآن میں وہ ایسی تغیر و تبدیلی پاتے جس سے احکام الٰہیہ اور شریعت اسلامیہ پر کوئی اثر پڑتا ہے تو وہ ضرور اس کے خلاف مظاہرہ کر کے جس صورت سے بھی ممکن ہوتا حقیقی قرآن کی نشر و اشاعت کرتے لیکن صورتِ حال اس کے خلاف تھی۔ انھوں نے اپنے مرتب کردہ قرآن کو اپنے پاس محفوظ رکھ کر موجودہ قرآن کو عملی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ اس طرح اگر چہ وہ فوائد جو ترتیب نزول کی بنا پر حاصل ہو سکتے تھے حاصل نہ ہو سکے لیکن اسلامی عقیدۂ قرآن کا شیرازہ درہم و برہم ہونے سے محفوظ رہا اور موجودہ قرآن کو تسلیم کر کے انھوں نے اپنے متبعین کو قرآن موجود پر ایمان لانے کی ایک سند دے دیا جس کی بناء پر وہ اس کو کلام الٰہی اور کتاب سماوی سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اس جزو کی تفصیل کے لئے ابھی آئندہ کا

انتظار کرنا چاہئے۔

ہم تو ابھی جمہور مسلمین کے نقطۂ نظر سے یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ عام محدثین نے قرآن مجید کے متعلق کس کس قسم کے روایات درج کئے ہیں اور وہ ایمان بالقرآن کے معیار پر ٹھیک اترتے ہیں یا نہیں۔

آیات قرآن میں صحابہ کے اختلافات

قرآن مجید میں صحابہ کا اختلاف صرف سلسلہ وترتیب میں منحصر نہ تھا بلکہ آیات قرآن میں بھی بہت نمایاں اختلافات پائے جاتے تھے چنانچہ صحیح بخاری میں ''مناقب ابن مسعود'' کے ذیل میں یہ روایت موجود ہے۔

حدثنا موسی عن ابی عواته عن مغیرة عن ابراهیم عن علقمة قال دخلت الشام فصلیت رکعتین فقلت اللّٰهم یسر لی جلیسا صالحا فرأیت شیخا مقبلا فلما دنا قلت ارجوان یکون استجاب قال من این انت قلت من اهل الکوفة قال افلم یکن فیکم صاحب النعلین والوسادة والمطهرة اولم یکن فیکم الذی اجیر من الشیطان اولم یکن فیکم صاحب السر الذی لا یعلمه غیره کیف قرأ ابن ام عبد واللیل اذا یغشی والنهار اذا تجلی والذکر والانثی فقال اقرأنیها النبی صلی الله علیه وسلم فاه الیٰ فیّ فما زال هؤلاء، حتی کادوا یردّوننی۔

علقمہ کا بیان ہے کہ میں شام میں گیا اور دو رکعت نماز پڑھ کر خدا سے دعا کی کہ خداوندا میرے لئے ایک اچھا جانشین پیدا کردے یکا یک ایک ضعیف العمر آدمی آتے ہوئے نظر آیا جب میرے قریب آیا تو میں نے کہا کہ انشاء اللہ میری دعا مستجاب ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ تم کون ہو میں نے کہا ''کوفہ کا رہنے والا ہوں۔'' کوفہ کا نام سن کر انھوں نے حذیفہ اور عمار کا تذکرہ کیا اور پھر کہا کہ سچ بتاؤ ابن مسعود و الیل اذا یغشی والی آیت کو کیونکر پڑھا کرتے تھے؟ میں نے کہا واللّیل اذا یغشی والنهار اذا تجلّیٰ والذکر والانثیٰ ضعیف العمر نے کہا کہ مجھ کو بھی رسالت مآبؐ نے اپنی زبان مبارک سے یونہی یاد کرایا تھا لیکن ان لوگوں نے اس کے خلاف مجھ پر اتنا زور ڈالا کہ قریب تھا میں اس قرائت کو ترک کردوں۔(۱)

۱۔ بخاری مطبوعہ کرزن پریس دہلی، ص ۵۳۱

یہی حدیث اس کے قبل مناقب عمار وحذیفہ کے تحت میں دوطریقوں سے مذکور ہے جن میں تصریح ہے کہ وہ بزرگ جن سے ملاقات ہوئی تھی ابولدرداء تھے اور دوطریقوں سے ''باب من القی له الوسادة،ص۹۲۹''میں مذکور ہے۔قرآن مجید کی موجودہ آیت میں وما خلق الذکر والانثیٰ ہے اور معلوم ہوا کہ ابن مسعود اور ابوالدرداء دونوں اس کو والذکر والانثی پڑھا کرتے تھے۔

علامہ شیخ مصطفی صادق رافعی نے بھی جمع قرآن کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:بقیت تلك الصحف عند ابی بکر ینتظر بها وقتها ان یحین حتیٰ اذا توفی سنہ ۱۳ھ صارت بعده الیٰ عمر فکانت عنده حتیٰ مات ثم کانت عند حفصة ابنته صدرا من ولایة عثمان و یومئذ اتسعت الفتوح و تفرق المسلمون فی الامصار فاخذ اهل کل مصر عن رجل من بقیة القراء فاهل دمشق وحمص اخذوا عن المقداد بن الاسود واهل الکوفة عن ابن مسعود واهل البصرة عن ابی موسی الاشعری وقرأ کثیر من اهل الشام بقرائة ابی بن کعب وکانت وجوه القرائة التی یؤدون بها القران مختلفةً وہ صحف جو زید بن ثابت نے جمع کئے تھے حضرت ابوبکر کے پاس باقی رہے اور وہ ان کے متعلق موقع کے منتظر رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا۔پھر حضرت عمر کے پاس رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوا پھر ان کی صاحبزادی حفصہ کے پاس حضرت عثمان کی خلافت کے ابتدائی دور میں محفوظ رہے،اس زمانہ میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا اور مسلمان اطراف عالم میں منتشر ہوگئے تھے۔لہٰذا ہر شہر والوں نے ایک شخص سے حفاظ قرآن میں سے قرآن کی تعلیم حاصل کی۔اہل دمشق نے مقداد بن الاسود سے اور اہل کوفہ نے ابن مسعود سے اور اہل بصرہ نے ابوموسیٰ اشعری سے اور بہت سے اہل شام نے ابی بن کعب کی قرأت سے پڑھنا شروع کیا اور قرأت کے اصول جن پر وہ لوگ قرأت کرتے تھے مختلف تھے۔(۱)

لیکن اس اختلاف کی ذمہ داری بھی رسالت مآبؐ کی طرف عائد ہوئی ان احادیث کی بناء پر جن میں یہ وارد ہوا ہے کہ انزل القراٰن علی سبعة احرف''قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔''

۱۔ اعجاز القرآن،ص ۳۸

اگرچہ ان احادیث کے معنی اتنے متشابہ سمجھے گئے کہ ان میں اختلافات کی حد نہ رہی یہاں تک کہ ابو حاتم محمد بن حبان بستی متوفی ۳۵۴ھ نے ان احادیث کے متعلق علماء کے اقوال کو ۳۵ کی تعداد تک پہونچایا ہے اور اکثر معانی کی بناء پر ان کو الفاظ قرآن کے اختلاف سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ہے لیکن موجودہ صحاح سے جس قول کی تائید حاصل ہوتی ہے اور جس پر علمائے اہل سنت نے صحابۂ کرام کے اختلافات کو منطبق کیا ہے وہ یہی ہے کہ حروف سے مراد آیات قرآن میں اپنے اپنے ذوق وزبان کے مطابق الفاظ کا تغیر وتبدل ہے کہ جس سے مطالب پر کوئی اثر نہ پڑے اس لئے کہ صحابہ مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور ہر قبیلہ کے لئے اکثر الفاظ کا تلفظ جو دوسرے قبیلہ میں متداول ہیں دشوار تھا اس لئے خداوند عالم کی جانب سے رسالتمآبؐ کو قرآن مجید سے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ سات طریقہ پر پڑھنے کی اجازت دی گئی اور حضرت ہر قبیلہ کے شخص کو اسی کے محاورہ کے مطابق قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ چنانچہ نقیب السادة الاشراف بالدیار المصریہ سید محمد علی ببلاوی اپنی کتاب ''التعریف النبی والقرآن الشریف'' مطبوعہ مصر ۱۳۴۵ھ، ص ۱۷ میں احرف سبعہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

المختار ان معنی ، نزول القرآن علی سبعة احرف اشتماله علی سبعة اوجه یقرأ القاری بایّ وجه منها علی البدل من صاحبه فایها سمع القاری من النبی صلی الله علیه وسلم قرأبه فقد وسع النبی صلی الله علیه وسلم ان یقرئ کل جماعة بالحرف ای اللغة التی مرنت علیها السنتهم فالهذلی یقرأ عنی حین بدل حتی حین والاسدی تعلمون بکسر التّاء بدل تعلمون بفتح التاء ولو اراد کل فریق ان یزول عن لغته وما جریٰ علیه لسانه طفلا وناشئا و کهلا لشق ذلك غایة المشقة فابیح للنبی صلی الله علیه وسلم ان یقرأهم بلغاتهم تیسیرا من الله علیٰ خلقه و تحقیقاً لما اتصف به صلی الله علیه وسلم من الرافة بامته والشفقة علیهم۔

''قول مختار یہ ہے کہ معنی سات حرفوں پر نزول قرآن کے یہ ہیں کہ اس میں سات صورتیں پائی جاتی ہیں جن کے ساتھ ادل بدل کر اس کو پڑھا جاسکتا ہے تو ان صورتوں میں سے جس طرح بھی رسالتمآبؐ کی زبان سے گوش گذار ہوجائے اس صورت سے پڑھنا جائز ہوگا کیونکہ رسالتمآبؐ کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ ہر

جماعت کو اسی کی مادری زبان اور فطری محاورہ کے مطابق قرآن کی تعلیم دیں تو قبیلۂ بنی ہذیل کا شخص مثلاً حتیٰ حین کو عتی حین پڑھ سکتا تھا اور بنی اسد کا آدمی تَعلمون بفتح تاء کو تِعلمون بکسر تاء پڑھنے کا حق رکھتا تھا۔ اور اگر ہر قبیلہ یہ چاہتا کہ اپنے روزمرہ محاورہ کو ترک کردے جس کا وہ بچپنے جوانی اور اڈھیر پن میں عادی ہو چکا ہے تو اس میں اس کے لئے بہت بڑی دشواری پیش آتی اس لئے رسالتمآبؐ کے لئے جائز قرار دیا گیا کہ وہ ان کو انہی کی زبان میں قرآن کی تعلیم دیں۔ اس طرح خداوند عالم کی طرف سے اپنے مخلوق کے لئے سہولت پیدا کی گئی اور حضرت رسولؐ کی مہربانی وشفقت اپنی امت پر پایۂ ثبوت کو پہونچی۔''

یہ اختلاف معمولی طریقۂ تلفظ یا صرف حرکات حروف میں محدود نہ تھا بلکہ یہ اختلاف اس حد پر تھا کہ جس سے صحابۂ کرام کو بعض اوقات تشویش اور اضطراب پیدا ہوجاتا تھا اور آخر جب جناب رسالتمآبؐ کی طرف رجوع کرتے تھے تو حضرت فرماتے تھے کہ دونوں ٹھیک ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر فرماتے ہیں۔

سمعت هشام بن حكيم يقرأ سورة الفرقان فی حیٰوة رسول الله صلی الله علیه وسلم فاستمعت لقرأته فاذا هو يقرأ علی حروف كثيرة لم يقرأنيها رسول الله صلی الله علیه وسلم فكدت اساوره فی الصلوة فتصبرت حتیٰ سلم فلببته بردائه فقلت من اقرأك هذه السورة التی سمعتك تقرأ قال اقرأنيها رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت كذبت فان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد اقرأنيها علیٰ غير ما قرأت فانطلقت به اقوده الیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت انی سمعت هذا يقرأ بسورة الفرقان علیٰ حروف لم تقرانيها فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ارسله اقرأ يا هشام فقرأ عليه القرائة التی سمعته يقرأ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم كذلك انزلت ثم قال اقرأ يا عمر فقرأت القرأة التی اقرانی فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم كذلك انزلت ان هذا القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرأوا ما تيسر منه۔

میں نے ہشام بن حکیم کو جناب رسالتمآبؐ کی زندگی میں سورۂ فرقان پڑھتے دیکھا، میں نے غور

سے سننا شروع کر دیا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت سے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جن کے ساتھ مجھ کو رسالتمآبؐ نے اس سورہ کی تعلیم نہیں دی تھی۔ بس قریب تھا کہ نماز ہی میں ان سے دھر پٹخ کروں مگر نفس پر جبر کر کے میں نے صبر کیا یہاں تک کہ انھوں نے سلام پھیرا، اس وقت میں نے بڑھ کے ان کی چادر کا پھندا بنا کر ان کے گلے میں ڈالا اور اس کو کھینچ کر کہا کہ تم کو یہ سورہ جو میں نے تمہیں پڑھتے سنا کس نے یاد کرایا ہے؟

انہوں نے کہا کہ مجھ کو جناب رسالتمآبؐ نے اس کی تعلیم دی ہے۔ میں نے کہا تم بالکل غلط کہتے ہو، رسالتمآبؐ نے خود مجھ کو اس سورۃ کی تعلیم دی ہے اس صورت سے جداگانہ کہ جس طرح تم نے پڑھا، یہ کہہ کر میں انھیں کھینچتا ہوا رسالتمآبؐ کے پاس لایا اور کہا کہ دیکھیے تو یہ سورۂ فرقان کو ایسے الفاظ کے ساتھ پڑھتا ہے جس کے خلاف آپ نے مجھ کو تعلیم دی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ''اسے چھوڑ دو تو (پھر ہشام کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں پڑھو تو! کیونکر پڑھتے ہو؟'' ہشام نے سورہ کو اسی طرح سے پڑھا جس طرح میں نے ان سے سنا تھا حضرت نے فرمایا، بیشک یہ سورہ اس طرح نازل ہوا ہے، پھر مجھ سے فرمایا اچھا تم پڑھو'' میں نے بھی اسی صورت سے جس طرح مجھ کو یاد تھا پڑھا حضرت نے فرمایا ہاں اس طرح بھی نازل ہوا ہے پھر فرمایا کہ یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے اور تم لوگوں کو اختیار ہے کہ ان میں سے جو آسان ہو اس طرح اس کو پڑھو۔''(۱)

اسی بناء پر حضرات شیخین نے اس اختلاف کو گوارا کیا اور اگرچہ خود قرآن مجید کو زید بن ثابت کے توسط سے جمع کرا لیا تھا۔ لیکن دوسرے صحابہ کو مجبور نہیں کیا کہ وہ بھی اسی صورت پر قرآن مجید کو پڑھیں اور تعلیم دیں بلکہ حضرت عمر نے ابی بن کعب کو جن کے مصحف کی ترتیب بالکل مصحف زید سے جداگانہ اور جن کی قرأت بھی ان کی قرأت سے مختلف تھی خود (نماز تراویح کا امام مقرر کیا اور تمام لوگوں کو مامور کیا کہ وہ انہی کی قرأت کے ساتھ پڑھیں اور جب کسی قرأت کے متعلق ان کو علم ہو گیا کہ یہ ابی بن کعب کی بتلائی ہوئی ہے تو پھر وہ سوائے تسلیم کر لینے کے اس کے متعلق ایک حرف بھی نہ کہتے تھے۔ چنانچہ ملا علی متقی نے کنز العمال میں نقل کیا ہے۔

۱۔ (مطبوعہ کرزن پریس دہلی، ص ۷۴۷)

عن بجالة قال مر عمر بن الخطاب بغلام وهو يقرأ فی المصحف النبی اولیٰ بالمومنین من انفسهم وازواجه امها تهم وهو اب لهم فقال یا غلام حکها قال هذا مصحف ابی فذهب الیه فسأله فقال انه کان یلهینی القرآن ویلهیك الصفق بالاسواق۔

حضرت عمر نے ایک لڑکے کو مصحف میں پڑھتے سنا کہ ''النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسهم وازواجه امها تهم وهو اب لهم ''۔حضرت نے فرمایا کہ اس (وهو اب لهم کے فقرہ) کو چھیل ڈالو اس نے کہا کہ یہ کسی اور کا نہیں ابی بن کعب کا مصحف ہے یہ سن کر آپ ابی کے پاس گئے اور ان سے دریافت کیا۔ ابی نے کہا کہ آپ کو کیا خبر، مجھے دن رات قرآن میں صرف ہوتا تھا اور آپ کو بازاروں میں پھرنے سے فرصت نہ تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابی کے مصحف میں آیہ النبی اولیٰ بالمومنین کے آخر میں وهو اب لهم کا ٹکڑا زیادہ تھا جو زید بن ثابت کے جمع کردہ قرآن میں موجود نہیں ہے لیکن حضرت عمر نے اس کو برداشت کرلیا۔

اور عبداللہ بن مسعود کے متعلق اتنا اعتماد تھا کہ جب حضرت عمر کے پاس ایک شخص نے مقام عرفات میں آکر کہا کہ جئتك من الکوفة وترکت بها رجلا یحکی المصحف عن ظهر قلبه میں کوفہ سے آیا ہوں اور وہاں ایک شخص کو چھوڑا ہے کہ وہ مصحف کو بالکل ازبر پڑھتا ہے تو یہ سن کر آپ کو بڑا شدید غصہ آیا اور کہا ویحك ومن هو جلدی بتا وہ کون؟ اس نے کہا عبداللہ بن مسعود فوراً آپ کا غصّہ فرو ہوگیا اور کہا واللہ ما اعلم احدا احق بذلك منه خدا کی قسم میں کسی شخص کو نہیں دیکھتا کہ وہ ان سے زیادہ اس امر کا حقدار ہو۔(۱)

اور اس روایت کو حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اصابہ (ج ۳، ص ۲۷۴) میں درج کیا ہے یہ صورتِ حال اسی طرح قائم رہی اور صحابہ پوری آزادی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت اپنے اپنے طریقہ پر

۱۔ ملاحظہ ہو استیعاب ابن عبدالبر برحاشیۂ اصابہ طبع مصر، ج ۲، ص ۳۲۲

کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت عثمان کا دور آیا اور اس وقت یہ اختلاف مفاد اسلامی کے لئے مضر قرار دیا گیا اور اطراف سے فریادیں آنے لگیں

کہ صحابہ کرام کے اختلاف کی وجہ سے قریب ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگیں اور خود قرآن مجید کے آیات کا انکار کردیں اور اس کی وجہ سے آتش فتنہ وفساد رونما ہو چنانچہ اس صورت حال اور اس کے نتائج کی مرقع کشی علامۂ رافعی نے حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔

کانت وجوه القرأة التی یودون بها القرآن مختلفة باختلاف الاحرف التی نزل علیها کما سیمر بك فکان الذی یسمع هذا الاختلاف من اهل تلك الامصار اذا احتو تهم المجامع او التقوا فی المواطن علی جهاد اعدآء هم یعجب من ذلك ان تکون هذه الوجوه کلها علی اختلاف ما بینها فی کلام واحد فاذا علم ان جمیع القراءات مسندة الیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم وانه اجازها لا یمتنع ان یحیك فی صدره بعض الشك وان ینطوی منها علیٰ شیئی اذا هو قد کان نشأ بعد زمن الدعوة وبعد ان اجتمع العرب علی کلمة واحدة فلا یلبث ان یجری ذلك الاختلاف مجری مثله من سائر الکلام فیری بعضه خیرا من بعضه و یظن منه الصریح والمدخول والعالی والنازل والافصح والفصیح واشباه ذلك ویعتد ما یراه فی القرآن من القرآن وهذا امران هو استفاض فیهم ثم مردوا علیه خرجو امنه ولا ریب الی المناقضة والملاحاة وبغی ان یردّ بعضهم علی بعض هذا یقول قرأتی وما اخذت به وذلك یقول بل قرأتی وما انا علیه ولیس من ورآء هذا اللجاج الاتکفیر والتأثیم ولا جرم انها الفتنة لا تفتأ بعد ذلك من دم قرأت کے اصول جن پر وہ لوگ قرآن کو پڑھا کرتے تھے مختلف تھے ان حروف کے اختلاف کی بناء پر کہ جن پر قرآن نازل ہوا تھا تو جب یہ مختلف صورتوں پر قرآن کو جاننے والے کسی مجلس میں جمع ہوتے یا میدان جنگ میں یکجا ہوتے تھے اور دیکھنے والا ان کے اختلافات کو قرآن مجید کے آیات میں دیکھتا تھا تو اسے تعجب ہوتا تھا کہ یہ سب الفاظ باوجود اپنے اختلاف کے ایک ہی کلام میں کیونکر صحیح ہو سکتے ہیں، اس کے ساتھ جب اسے معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب قرائتیں رسالت مآبؐ

کی طرف استناد رکھتی اور حضرت نے ان کے متعلق اجازت دی ہے تو یقینا موقع تھا کہ اس کے سینہ میں شبہ و شک کسی حد تک خراش پیدا کرے اور کچھ نہ کچھ دل میں آئے اس لئے کہ اس شخص کی نشو و نما ایسے وقت پر ہوئی تھی کہ جب ابتدائے دعوت اسلام کو طویل زمانہ گذر چکا ہے اور تمام قبائل عرب ایک کلمہ پر جمع ہو چکے ہیں۔ اس کا قریبی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اس اختلاف کو قرآن کے علاوہ دوسری کتابوں کے اختلاف نسخ کی صورت سے قرار دے کر ان میں محاکمہ پر تیار ہو جاتا کہ یہ اس سے بہتر ہے اور یہ صریح ہے وہ مدخول، یہ عالی ہے اور وہ پست، یہ افصح ہے اور وہ فصیح اور اس طرح اپنے ذاتی خیالات کو قرآن میں داخل کر دیتا۔

یہ ایسا امر تھا کہ اگر اس کو زیادتی ہوتی اور لوگوں کو اس کا چسکا لگتا تو یقینا نتیجہ میں باہمی مناقشہ و منازعہ اور نقض و رد تک نوبت پہونچتی، یہ کہتا کہ میری قرأت اور میرا انتخاب بہتر ہے، وہ کہتا کہ نہیں بلکہ میری قرأت اور میرا مسلک بہتر ہے اور اس اختلاف کے آخر میں سوائے اس کے کہ ایک دوسرے پر کفر کا حکم لگائے اور گنہگار بتلائے کوئی اثر مترتب نہ ہوتا اور یقینا یہ ایک ایسا فتنہ تھا جس کی انتہا آخر میں خونریزی تک ہونا ناگزیر تھی۔''

حضرت عثمان کو اس امر کی طرف خاص طور سے توجہ ہوئی خصوصاً اس وقت کہ جب حذیفہ بن الیمان ارمینیہ و آذربائیجان کی فتح کے سلسلہ میں جنگ پر گئے اور وہاں سے واپس آکر انھوں نے بڑی اہمیت کے ساتھ لوگوں کے اختلافات کا تذکرہ کیا اور کہا کہ جلد خبر لیجئے نہیں تو امت اسلامیہ یہود و نصاری کی طرح کتاب خدا میں مختلف ہو جائے گی، حضرت عثمان کو اس کے سوا کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ حضرت رسولؐ کی اجازت کو منسوخ کرتے ہوئے تمام لوگوں کو ایک ہی قرأت کا پابند بنا دیں اور چھ قرأتوں کو جن کے ساتھ پڑھنے کی اب تک اجازت تھی جرم قرار دے دیں چنانچہ اس غرض کے لئے انھوں نے اس قرآن کو جو حضرت ابوبکر کے زمانہ میں زید بن ثابت کے ہاتھوں جمع ہو چکا تھا حفصہ بنت عمر کے پاس سے منگوا بھیجا اور طے پایا کہ اسی کے موافق نسخے لکھوا کر تمام ممالک میں منتشر کئے جائیں اور اس کے سوا جتنے نسخے قرآن کے مجتمع یا غیر مجتمع صورت میں مختلف صحابہ کے پاس پائے جاتے ہیں ان کو نذر آتش کر دیا جائے اور اس امر کی احتیاط کے لئے کہ ان نقل شدہ نسخ کو کوئی اختلاف پہلے نسخہ کے ساتھ نہ ہو اور یہ کہ خود اس نسخہ پر نظر ثانی بھی ہو جائے پھر زید بن ثابت کو منتخب کیا گیا اور ان کے ساتھ عبداللہ بن زبیر و سعید بن العاص و عبدالرحمن بن حارث بن ہشام مخزومی کو معاون کے طور

پر ان کا شریک بنایا گیا۔

اس واقعہ کا تذکرہ صحیح بخاری میں حسب ذیل الفاظ میں موجود ہے۔

حدثنا موسیٰ قال حدثنا ابراھیم قال حدثنا ابن شھاب ان انس بن مالك حدثه ان حذیفة بن الیمان قدم علیٰ عثمان و کان یغازی اھل الشام فی فتح ارمینیّة وآذربیجان مع اھل العراق فافزع حذیفه اختلافھم فی القرأة فقال حذیفة لعثمان یا امیرالمومنین ادرك ھذہ الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیھود والنصاری فارسل عثمان الیٰ حفصة ان ارسلی الینا بالصحف ننسخھا فی المصاحف ثم نردھا الیك فارسلت بھا حفصة الیٰ عثمان فامر زید بن ثابت وعبداللہ بن الزبیر وسعید بن العاص وعبدالرحمٰن بن الحارث بن ھشام فنسخوھا فی المصاحف وقال عثمان للرّھط القرشیین الثلثة اذا اختلفتم انتم و زید بن ثابت فی شیئی من القرآن فاکتبوہ بلسان قریش فانما نزل بلسانھم ففعلوا حتیٰ اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد عثمان الصحف الیٰ حفصة وارسل الیٰ کل افق بمصحف ممّا نسخوا وامر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق۔

انس بن مالک کا بیان ہے کہ حذیفہ بن یمان حضرت عثمان کے پاس آئے اور اس کے قبل وہ آرمینیہ وآذر بائیجان کی فتح کے سلسلہ میں اہل شام وعراق کے ساتھ جنگ میں شریک تھے اور اس دوران میں جو اختلافات انھوں نے قرأت قرآن میں دیکھے ان سے پریشان ہوگئے تھے اس لئے انھوں نے حضرت عثمان سے کہا کہ اے فرمانروائے مسلمین اس امت کی خبر لیجئے قبل اس کے کہ ان میں کتاب خدا کے بارے میں ویسا اختلاف پڑے جیسا کہ یہود ونصاریٰ کے اندر ہے۔

یہ سن کر حضرت عثمان نے حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کہ وہ قرآن کے اجزاء جو تمہارے پاس ہیں بھیج دو ہم اس کو مجموعی حیثیت سے مصحف کی صورت میں نقل کرا کے واپس کردیں گے، حفصہ نے ان اجزاء کو عثمان کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے زید بن ثابت اور عبداللہ بن زبیر اور سعید بن عاص اور عبدالرحمن بن حارث بن ہشام کو حکم دیا اور انھوں نے اس کو مصاحف کی صورت میں نقل کیا اور عثمان نے ان تینوں قرشی آدمیوں کو حکم دیا

تھا کہ جب تم میں اور زید بن ثابت میں کسی لفظ کے متعلق اختلاف ہوتو اس کو قریش کے محاورہ پر لکھنا کیونکر قرآن کا اصلی نزول قریش کی زبان میں ہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا یہاں تک کہ جب ان اجزاء کی نقل مصحف کی صورت میں ہوگئی تو وہ اجزاء حفصہ کے پاس واپس کئے گئے اور اطراف و جوانب میں سے ہر ملک میں ایک نسخہ اس کا بھیج دیا گیا اور جتنے قرآن کے نسخے اس کے علاوہ متفرق اجزاء یا مجتمع کتاب کی صورت میں تھے ان کے متعلق حکم ہوا کہ وہ آگ میں جلا دیئے جائیں''۔(۱)

حدیث مذکور سے صاف ظاہر ہے کہ جمع قرآن کے سلسلہ میں حضرت عثمان نے خود کاوش و کاہش کی ضرورت نہیں سمجھی تھی بلکہ انھوں نے اسی جمع و تالیف پر اعتماد کیا جو حضرت ابوبکر کے حکم سے عمل میں آچکی تھی ، بیشک اس اطمینان حاصل کرنے کے لئے کہ موجودہ نسخے اس کے مطابق رہیں تصحیح و تنقیح کا کام انہی زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا جو پہلی تالیف کے ذمہ دار تھے اور چونکہ منظور یہ تھا کہ قرآن کی جو مختلف قرأتیں ہوگئی ہیں ان کا قلع قمع ہوکر ایک قرأت پر اتفاق حاصل ہو اس لئے ان الفاظ کی تعیین کے لئے جن کا طریقہ ادا اور رسم الخط مختلف ہے اور اس اعتبار سے ان میں اختلاف کی گنجائش ہے تین قرشی آدمیوں کو ان کا شریک کار قرار دیا گیا تھا لیکن یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اس اہتمام و انتظام کے جو سابقہ مرتبہ جمع قرآن میں ہو چکا تھا اب کی جو نقل کے سلسلہ میں زید بن ثابت نے مراجعہ کیا تو خود ان کو اس قرآن میں بعض آیات کی فروگذاشت نظر آئی جنھیں پھر تحقیق کے بعد اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ بخاری میں حدیث مذکور بالا کے بعد ہی لکھا ہے:

قال ابن شهاب واخبرنى خارجة بن زيد بن ثابت سمع زيد بن ثابت قال فقدت اٰية من الاحزاب حين نسخنا المصحف قد كنت اسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقرأبها فالتمسناها فوجدناها مع خزيمة بن ثابت الانصارى من المومنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فالحقنا ها فى سورتها فى المصحف۔

''ابن شہاب نے زید بن ثابت کے صاحبزادے سے خود زید بن ثابت کا بیان نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے جب

۱۔ بخاری کرزن پریس دہلی، ص ۷۴۶

میں مصحف کے لکھنے میں مصروف تھا تو ایک آیت سورۂ احزاب میں کی جس کو میں رسالت مآبؐ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا نہ ملی۔ ہم نے اس کو ڈھونڈھنا شروع کیا تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس دستیاب ہوئی من المومنین رجال صدقوا ما عاھدنا اللہ علیہ۔'' چنانچہ ہم نے اس کو اس کے سورہ کے آخر میں مصحف کے اندر درج کر دیا۔''

درحقیقت زید بن ثابت کو آیت پوری یاد نہ تھی ورنہ انھیں اس کے ڈھونڈھنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ کچھ کچھ اس کی لفظیں یاد آتی تھیں کہ حضرت ایک اس قسم کی آیت سورۂ احزاب میں پڑھا کرتے تھے اور وہ اب دستیاب نہیں ہوتی اسی بناء پر انھوں نے اس کو تلاش کرنا شروع کیا جس میں وہ خزیمہ بن ثابت کے پاس کامیاب ہوئے۔

اس سے یہ خیال پادر ہوا ثابت ہوجاتا ہے کہ زید بن ثابت رسالتمآبؐ کی زندگی میں حفظ قرآن کر چکے تھے اور اس کی دلیل یہی احادیث ہیں جن میں ان کا پتہ دے دے کر آیاتِ قرآن کی جستجو کرنا مذکور ہے لیکن ہمارے بیان سے ثابت ہو گیا کہ اس خیال میں کوئی وزن نہیں ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ پہلی مرتبہ جمع قرآن بالکل بے توجہی و کم التفاتی کے ساتھ ہوا تھا اور مقابلہ و تکرار نظر کی نوبت نہ آئی تھی، یقینا کتنی مرتبہ مقابلہ اور کس کس طرح تکرار نظر کی گئی ہوگی جب یہ اعتماد حاصل ہوا کہ قرآن مجید جمع ہو گیا۔ لیکن پندرہ برس کے بعد جب حضرت عثمان کے دور میں نظر کی نوبت آئی تو ایک آیت کم معلوم ہوئی پھر اس مرتبہ کے جمع و تالیف میں کیا ضمانت ہوسکتی ہے کہ کسی قسم کی کوئی آیت نہیں رہ گئی۔

پھر الفاظ قرآن میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خامیاں رہ گئیں تھیں جن کی اصلاح اس مرتبہ کی گئی جیسا کہ ابن فارس نے ہانی سے نقل کیا ہے کنت عند عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ وھم یعرضون المصاحف فارسلنی بکتف شاۃ الی ابی بن کعب فیھا "لم یتسن و "فامھل الکافرین" و لا تبدیل للخلق" قال فدعا بالدواۃ فمحا احدی اللامین و کتب "لخلق اللہ" ومحا فامھل و کتب فمھّل و کتب "لم یتسنہ" الحق فیھاھاء اوالقرائۃ علی ھذا الرسم میں حضرت عثمان کے پاس تھا جس وقت مصاحف کا مقابلہ ہو رہا تھا، انہوں نے مجھ کو ایک بکری کا شانہ دے کر ابی بن کعب کے پاس بھیجا جس پر لکھا تھا ''لم یتسنّ اور فافھل الکافرین اور لا تبدیل

للخلق ابی بن کعب نے دوات منگوائی اور ''للخلق'' کی لفظ میں ایک لام چھیل کر لخلق اللہ دیا اور فامھل کو چھیل کر فمھّل بنا دیا اور لم یتسن ؓمیں ہا ملا کر لم یتسنّہ کر دیا اور اب اسی صورت پر پڑھا جاتا ہے''(۱)

اب اس کو جانے دو کہ زید بن ثابت صاحب عرضۂ اخیرہ سے آخران الفاظ میں غلطی کیوں ہوئی تھی اور پھر کیا یہ شبہہ پیدا نہیں ہوتا کہ کسی اور لفظ میں بھی ایسی غلطی ہو۔ لیکن اتنا سوال غالباً حق بجانب سمجھا جائے گا کہ مذکورہ صورت حال میں لا تبدیل لخلق اللہ اور اس کے ساتھ والی دونوں لفظیں کیا صرف ابی بن کعب کی تجویز کا نتیجہ نہیں ہیں اور پھر کیا ان کا تواتر باقی رہا ہے؟

یہ سوال گذشتہ جمع قرآن اور موجودہ تصحیح و تنقیح دونوں موقعوں کے متعلق بہت اہم ہے کہ آخر زید بن ثابت کو بڑے بڑے صحابہ کی موجودگی میں جمع قرآن کے لئے منتخب کرنے کی کیا وجہ تھی؟ اور ان میں کون سا امتیاز تھا کہ ابی بن کعب وعبداللہ بن مسعود ایسی ہستیوں کے مقابلہ میں ان کے جمع کردہ قرآن کا اعتبار کیا جائے؟

اس کے متعلق علمائے اہلسنت نے بڑی کاوش کے ساتھ یہ وجہ نکالی ہے کہ حضرت جبرئیل جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ ہر سال قرآن کا مقابلہ کیا کرتے تھے اور اس میں ہر مرتبہ کچھ آیات منسوخ اور کچھ متغیر اور کچھ اپنی جگہ سے دوسری جگہ ادل بدل کر دیئے جاتے تھے اور آخری مرتبہ اس سال کہ جب جناب رسالتمآبؐ کا انتقال ہونے والا تھا۔ انھوں نے دو مرتبہ آکر قرآن کا مقابلہ کیا اور زید بن ثابت نے اسی سال قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی لہٰذا وہ اس مقابلہ کے نتیجہ پر مطلع تھے جو اس سال ہوا تھا اور اس لئے ان کی جمع و ترتیب بالکل اس جمع و ترتیب کے موافق تھی جس پر رسالت مآبؐ کا اپنی زندگی کے آخری دور میں عمل درآمد رہا اور جس طرح وہ اپنے آخر وقت تک قرآن کی تلاوت فرماتے تھے بخلاف ابی بن کعب اور ابن مسعود وغیرہ دیگر صحابہ کے کیونکہ ابن مسعود نے مکہ میں قرآن حفظ کیا تھا اور وہیں رسالت مآبؐ کو پڑھ کر سنایا تھا اور ابی بن کعب نے ہجرت کے بعد اور اسی زمانہ میں رسالت مآبؐ کو سنایا تھا۔(۲)

لیکن جہاں تک غور کیا جاتا ہے یہ توجیہ صرف خوش عقیدگی کا نتیجہ اور دل کو تسکین دے لینے کا ذریعہ ہے اور مستند احادیث و واقعات کی بناء پر اس کا کوئی وزن معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ اس موقع پر جب حضرت ابوبکر نے جمع

۱۔ اعجاز القرآن رافعی، ص ۴۶

۲۔ ملاحظہ ہو اعجاز القرآن، ص ۳۶، ۳۷

قرآن کا کام زید بن ثابت کے سپرد کیا ہے اور ان کو بلا کر اس امر پر مامور فرمایا ہے تو جو وجوہ ترجیح ان کے لئے بتلائے گئے وہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔

اس وقت جو کچھ بھی ارشاد ہوا تھا وہ یہ کہ ''انك شاب عاقل لا نتهمك و قد كنت تكتب الوحى لرسول الله صلى الله عليه وسلم'' تم نوعمر عقلمند آدمی ہو تم پر ہم کو اطمینان ہے اور تم رسالت مآبؐ کے پاس کاتب وحی بھی رہ چکے ہو''۔

بھلا اگر زید بن ثابت کے لئے ایک اتنی بڑی خصوصیت حاصل ہوتی کہ وہ عرضۂ اخیرہ (آخری مقابلہ قرآن میں) موجود تھے تو اس موقع پر اس کا تذکرہ نہ کیا جاتا اور یہ نہ کہا جاتا کہ تم عرضۂ اخیرہ میں موجود تھے؟

یہی امتیاز وہ ہوتا جو مقام ترجیح میں ان کے اختصاص کا ضامن ہوتا، اس کو چھوڑ کر یہ کہنے کا کون سا موقع تھا کہ تم نوعمر ہو؟ کیا نوعمر ہونا اتنی بڑی ذمہ داری کے استحقاق کی ضمانت ہے؟

یہ ایک باریک مسئلہ ہے کہ منصب خلافت کے لئے تو سن رسیدہ ہونا وجہ ترجیح سمجھا جائے اور جمع قرآن کے موقع پر جوان سال ہونا اختصاص کی دلیل، رہ گئی عقل اس سے غالباً دوسرے صحابہ بھی محروم نہ تھے۔ ''ہم تم کو متہم (نا قابل اعتماد نہیں سمجھتے'' یعنی کیا دوسرے صحابہ جتنے ہیں وہ متہم اور نا قابل اعتماد ہیں؟ پھر آخر احکام شرعیہ تو عام مسلمانوں کو انہی صحابہ کے ذریعہ سے پہونچے ہیں۔ ان تمام احکام کا حشر کیا ہوگا؟ کاتب وحی ہونے کی فضیلت بھی مخصوص نہیں بلکہ بہت سے صحابہ اس میں شرکت کے دعویدار ہو جائیں گے۔

پھر حضرت ابوبکر کا یہ فرمانا فتتبع القران فاجمعه ''قرآن کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کرو''۔ یہ صاف اس امر کی دلیل ہے کہ زید بن ثابت کو قرآن مجید حفظ نہ تھا اور نہ وہ اس ترتیب پر مطلع تھے جس پر آخری مرتبہ عرض قرآن ہوا تھا ورنہ ان کو تتبع کے بعد جمع کا حکم نہ ہوتا بلکہ یہ کہا جاتا کہ اسی صورت پر جو تمہارے سینہ میں موجود ہے قرآن جمع کردو۔

اور پھر زید بن ثابت نے جو صورت جمع کی بتلائی ہے فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف وصدور الرجال ''میں نے قرآن کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر درخت کی چھالوں اور پتھر کے ٹکڑوں اور مختلف اشخاص کے محفوظات سے جمع کیا'' یہ بھی صریح دلیل ہے کہ وہ حافظ قرآن نہ تھے۔ باوجود زید بن ثابت

کے اس اعتراف کے جوصحیح بخاری ایسی کتاب میں موجود ہے کیا سادہ لوحی نہیں ہے کہ ان کو حافظ قرآن اور صاحب عرضۂ اخیرہ ہونے کی وجہ سے جمع قرآن کا حقدار سمجھا جائے۔

یہ کہنا کہ ابن مسعود نے مکہ معظّمہ میں قرآن حفظ کیا تھا اور رسالت مآبؐ کو پڑھ کر سنایا تھا اور ابی بن کعب نے ہجرت کے بعد مدینہ میں جیسا کہ علامۂ رافعی نے تحریر کیا ہے عجیب چیز ہے۔

اے حضرت مکہ میں قرآن پورا نازل ہی کب ہوا تھا جو ابن مسعود وہاں حفظ کرتے اور رسالت مآبؐ کو سناتے اور اسی طرح مدینہ کے ابتدائی دور میں پورا قرآن کہاں موجود تھا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے مکہ میں جتنا قرآن نازل ہوا تھا وہ مکہ میں یاد کیا اور پڑھ کر سنایا تھا اور پھر رسالتمآبؐ کے آخر زمانۂ حیات تک جتنا جتنا نازل ہوتا گیا اتنا اتنا یاد کر کے سناتے گئے اس طرح خدمت رسولؐ میں ان کے انتہائی تعلیم پانے کا زمانہ عرضۂ اخیرہ تک پہونچتا ہے اور اس موقع پر جو کچھ تغیر وتبدل ہوا ہوگا وہ حضرت کی جانب سے عبداللہ بن مسعود و ابی بن کعب کو بھی خاص طور پر بتلایا گیا ہوگا خصوصا جب کہ حضرت کی توجہ ان دونوں صحابیوں کو تعلیم قرآن دینے کے متعلق خاص طور سے مبذول تھی یہاں تک کہ ابی بن کعب کے متعلق حضرت نے یہاں تک فرمایا کہ امرت ان اقرأ علیك القرآن مجھ کو خدا کا حکم ہوا ہے کہ میں تمہیں قرآن پڑھ کر سناؤں۔ اور بعض روایات میں ہے اعرض علیك القرآن اور اس بناء پر حضرت نے تمام صحابۂ کرام میں ان کو مخصوص امتیاز دے کر فرمایا۔ اقرأ امتی ابیّ ''میری امت میں سب سے بہتر حافظ قرآن ابی ہیں'' اور خود حضرت عمر کی یہ روایت متعدد طرق سے نقل ہوئی ہے کہ اقضانا علی و اقرانا ابی ہم میں سب سے بہتر قاضی علی ہیں اور سب سے بہتر حافظ قرآن ابی ہیں۔''

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو استیعاب ابن عبدالبر برحاشیہ اصابہ مطبوعہ مصر، ج ۱، ص ۴۸)

اور عبداللہ بن مسعود کے متعلق حضرت کا ارشاد تھا من سرّہ ان یقرأ القرآن غضًا کما انزل فلیقرأ علی ابن ام عبد ''جو شخص چاہتا ہو کہ قرآن مجید کی بالکل تروتازہ صورت پر جس طرح نازل ہوا ہے تعلیم حاصل کرے تو وہ اس کو ابن مسعود سے پڑھے۔ اس روایت کی حافظ نسائی نے حضرت عمر سے تخریج کی ہے اور حافظ ابن حجر نے اصابہ، ج ۳، ص ۲۷۴ اور ابن عبدالبر نے استیعاب مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد، ج ۱، ص ۳۷۱ اور ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ، ج ۴، ص ۹۶ میں اس کو درج کیا ہے اور پھر ان صحابہ میں کہ

جن سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کا رسالت مآبؐ نے حکم دیا تھا عبداللہ بن مسعود کا پہلا نمبر ہے چنانچہ عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول خذوا القرآن من اربعة من ابن ام عبد فبدأبه ومعاذ بن جبل وابیِّ بن کعب و سالم مولی ابی حذیفة ''میں نے رسالت مآبؐ کو فرماتے سنا کہ قرآن کی تعلیم چار آدمیوں سے حاصل کرو اور ان میں سب سے پہلے ابن مسعود کا نام لیا۔''

یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ ان صحابہ میں کہیں زید بن ثابت کا نام نہیں اور نہ حضرت رسول اکرمؐ نے حافظ قرآن ہونے کی حیثیت سے کبھی ان کی تعریف کی بیشک ان کی مدح میں جو فقرہ ائمہ حدیث نے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ افرضکم زید بن ثابت ''تم میں علم میراث کے جاننے والے سب سے زیادہ زید بن ثابت ہیں۔'' لیکن اس کو حفظ قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اور پھر ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس نے تو مذکورۂ بالا خیال کا تار پود بکھیر کر حقیقت کو بالکل واضح کر دیا ہے ان کا بیان ہے کہ عرضۂ اخیرہ میں حاضر ہونے والے عبداللہ بن مسعود تھے نہ زید بن ثابت چنانچہ ہم اس روایت کو استیعاب ابن عبدالبر سے نقل کرتے ہیں۔

روی و کیع وجماعة معه عن الاعمش عن ابی ظبیان قال قال لی عبدالله بن عباس ایّ القرأتین تقرأ قلت القرأة الاولیٰ قرأة ابن امّ عبد فقال لی اجل هی الاُخرة ان رسول الله کان یعرض القراٰن علی جبرئیل فی کل عام مرة فلما کان العام الذی قبض فیه رسول الله عرضه علیه مرتین فحضر ذلك عبدالله فعلم مانسخ من ذلك و بدّل۔ (۱)

''وکیع اور ایک جماعت نے اعمش کی زبانی ابوظبیان سے نقل کیا ہے کہ مجھ سے عبداللہ بن عباس نے کہا تم کس قرأت کے ساتھ قرآن پڑھتے ہو، میں نے کہا سب سے مقدم یعنی ابن مسعود کی قرأت انھوں نے کہا ہاں اور وہی سب سے آخری بھی ہے جناب رسالتمآبؐ جبرئیل کے ساتھ ہر سال ایک مرتبہ قرآن کا مقابلہ

۱۔ مطبوعہ حیدر آباد، ج ۱، ص ۳۷۲

کرتے تھے لیکن جس سال حضرت کا انتقال ہوا تو دو مرتبہ قرآن کو پیش کیا گیا۔ اس موقع پر عبداللہ موجود تھے اور جو کچھ تغیر و تبدل ہوا سب پر مطلع ہوئے۔''

اسی کے مطابق حافظ جلال الدین سیوطی نے درمنثور میں حسب ذیل روایات نقل کئے ہیں۔

(۱) اخرج ابن الانباری عن مجاهد قال قال لنا ابن عباس ایّ القرأتین تعدّون اوّل قلنا قرأة عبدالله قال فان رسول الله كان يعرض القران على جبرئيل وان عرضه عليه فی آخر سنته مرتين فقرأة عبدالله اخر۔

''ابن انباری نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ ہم سے ابن عباس نے کہا تم لوگ دونوں قرأتوں میں سے کس کو اول شمار کرتے ہو۔''

ہم نے کہا ابن مسعود کی قرأت کو فرمایا رسالتمآبؐ قرآن کا جبرئیل کے ساتھ ایک مرتبہ مقابلہ کیا کرتے تھے اور اپنی زندگی کے آخری سال آپ نے دو مرتبہ ان کے ساتھ مقابلہ کیا تو عبداللہ کی قرأت سب سے آخر تھی۔

(۲) اخرج ابن الانباری عن ابن مسعود قال كان جبرئيل يعارض النبی رضی اللہ عنہا بالقران فی كل سنة مرة وانه عارضه بالقرآن فی آخر سنة مرتين فاخذته من النبی ذلك العام۔

ابن مسعود کا خود بیان ہے کہ جبرئیل ہر سال قرآن کا ایک مرتبہ رسالتمآبؐ سے مقابلہ کراتے تھے اور انھوں نے آخری سال دو مرتبہ مقابلہ کیا اور میں نے اس سال قرآن کو جناب رسالتمآبؐ سے اخذ کیا ہے۔''

(۳) عن ابن مسعود قال لو اعلم احد ااحدث بالعرضة الاخيرة منّی لرحلت اليه۔

''ابن مسعود کہتے تھے کہ اگر میں جانتا کوئی صحابی عرضۂ اخیرہ میں میرے بعد حاضر ہوا ہے تو میں ضرور اس کے پاس قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کو جاتا۔''

اب ان روایات کی موجودگی میں اس خیال کا کیا وزن باقی رہ سکتا ہے کہ عرضۂ اخیرہ میں شریک ہونے والے زید بن ثابت تھے اور پھر جبکہ وہ کسی روایت کی طرف مستند نہیں ہے بلکہ لوگوں کا ذاتی خیال ہے

جس کو ابن سیرین نے عرضۂ اخیرہ کی کیفیت کے بعد اس طرح بیان کیا ہے کہ **فیرون ان تکون قرأتنا هذه علی العرضة الاخيرة** ''لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہماری موجودہ قرأت اسی عرضۂ اخیرہ کے مطابق ہے''۔(۱)

کوئی بتلائے کہ مذکورہ صورت حال میں آخر زید بن ثابت کے جمع کردہ قرآن پر تمام دوسرے صحابہ کی مخالفت کے باوجود اعتماد کی کیا وجہ ہے؟ اور پھر اعتماد بھی ایسا کہ جتنے قرآن دوسرے صحابہ کرام کے تھے وہ صفحۂ دنیا سے معدوم کر دیئے جائیں اور ان کو آگ کے اٹھتے ہوئے شعلوں کی نذر ہونا پڑے۔

خیر ابھی تک واقعات کا سلسلہ یہاں تک پہونچا کہ حضرت عثمان نے اسی قرآن کے اجزاء کو جو حضرت ابوبکر کے زمانہ میں جمع کئے گئے تھے۔ حفصہ کے پاس سے منگا کر نقل کرالیا تھا اور مقابلہ کے بعد حفصہ کو واپس کر دیئے گئے اور اس طرح وہ نسخۂ اصل اور یہ تمام اس کے نقول تھے جو مختلف بلاد کی جانب روانہ کئے گئے۔

لیکن اس کے بعد واقعہ کی نیرنگی زیادہ اور دیکھنے والے کی حیرانی میں اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حفصہ بنت عمر کے انتقال کے بعد حضرت عثمان نے وہ اجزائے قرآن جو ان کے پاس موجود تھے عبداللہ بن عمر سے بڑے اصرار کے ساتھ منگوا کر انھیں پانی سے دھلوا ڈالا۔

اس واقعہ کا تذکرہ کتاب ''التعریف بالنبی والقرآن الشریف'' مطبوعہ مصر، ص ۸۷ میں حسب ذیل الفاظ میں موجود ہے۔ **فكتبوا المصحف واستعرضوه عرضة بعد اخرى فلما لم يجدوا شيئا ارسل عثمان الى ام المومنين حفصه بسألها ان ترسل اليه الصحف لعرض المصحف عليها وحلف لها ليردّنّها اليها بعد مقابلة المصحف بها فاعطته اياها فعرض عليها المصحف فلم يختلفا فی شئی فردها اليها وطابت نفسه بما فعل وامر الناس ان يكتبوا مصاحف فلما ماتت حفصة ارسل عثمان الى عبدالله بن عمر يطلب الصحف منه وشدّد فی طلبها فاعطاه عبدالله اياها فغسلها غسلا۔**

''ان صحابہ نے مصحف کو لکھا اور چند مرتبہ اس پر نظر کی گئی جب کوئی غلطی نہ ملی تو عثمان نے ام المومنین حفصہ کے

۱۔ درمنثور، ج ا، ص ۱۰۶

پاس کہلوا بھیجا کہ وہ اجزائے قرآن بھیج دیجئے تاکہ مصحف کا مقابلہ ان کے ساتھ ہوجائے اور قسم کھائی کہ میں مقابلہ کے بعد واپس کردوں گا چنانچہ حفصہ نے ان کو بھیج دیا اور مصحف کا ان سے مقابلہ کیا گیا تو ذرا سا بھی اختلاف دونوں میں نہ نکلا۔ اس وقت حضرتِ عثمان کو اطمینان حاصل ہوا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس مصحف کے نقول تحریر کریں۔ جب حفصہ کا انتقال ہوا تو حضرت عثمان نے عبداللہ بن عمر کے پاس آدمی بھیجا کہ وہ ان اجزاء کو بھیج دیں اور بڑی سختی کے ساتھ ان سے مطالبہ کیا اس وقت انھوں نے (مجبور ہوکر) وہ اجزاء بھیج دیئے اور حضرت عثمان نے پانی سے ان کو بالکل دھلوا ڈالا۔''

دنیائے علم وتمدن کی سیر کرو شرق وغرب کے علمی اداروں پر نظر کرو اور علم دوست وعلم پرور اقوام کی جدوجہد کا جائزہ لو، تم کو اندازہ ہوگا کہ کسی کتاب کے اصلی نسخہ کی کتنی قدروقیمت ہے اور اس کا وجود اس کے شایع شدہ نقول کے اعتبار میں کتنی بڑی اہمیت رکھتا ہے؟

ہزاروں لاکھوں روپیہ صرف کرکے مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں یا اس زمانہ کے نقل شدہ نسخے یا قدیم سے قدیم کتبے حاصل کرنا اور ان کو انتہائی اہتمام وانتظام کے ساتھ محفوظ رکھنا اسی غرض کے لئے ہے۔

کتاب کے قدیمی نسخہ کا جو کہیں دستیاب ہوگیا ہے فوٹو چھاپ کر شایع کرنا جو اب مطابع یورپ و جرمن اور ان کی تقلید میں مصر وبیروت کا طرۂ امتیاز بنا ہوا ہے اسی لئے ہے کہ اس میں کسی قسم کے تصرف وتغیر کے احتمال کا سدباب ہوجائے۔

کیا اس کے برخلاف کوشش کے ساتھ نسخۂ اصل کو حاصل کرکے تلف کردینا اور اس کو دنیا کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوجھل بنادینا کسی صحیح فلسفہ پر مبنی سمجھا جاسکتا ہے؟ کیا اس وجہ سے قرآن مجید کے متعلق طرح طرح کے شبہے پیدا کئے جانے کا امکان نہ ہوگیا اور اس کے سند واعتبار کو صدمہ نہ پہونچا!

اور پھر اس پر طرہ یہ کہ محدثین امت نے جو حفاظ وایمۂ واصحاب سنن ایسے القاب سے سرفراز ہیں اپنے جوامع حدیث وسیر میں ایسے روایات درج کردیے ہیں جن میں حضرت عثمان اور ان کے اشاعت دادہ موجود قرآن پر حسب ذیل الزامات عائد کئے گئے ہیں۔

(ا) یہ کہ اس قرآن میں کتابت کی غلطیاں موجود ہیں اور وہ اسی غلط صورت پر متواتر ہوکر دنیائے

اسلام میں شایع ہے۔

(۲) یہ کہ حضرت عثمان کو خود بعض اغلاط کا احساس ہوا جس کو انھوں نے پہلی فرصت میں تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ بعد کے حوالہ کیا جس کا پھر موقع نہ ملا اور وہ ابتک باقی ہیں۔

(۳) یہ کہ حضرت عثمان نے قرآن میں تغییر و تبدیل کی اور اس کو پہلی صورت پر باقی نہیں رکھا۔

اب کیا اگر اصلی نسخہ قرآن مجید کا یعنی حضرت ابو بکر کے زمانہ کا جمع کردہ موجود ہوتا تو حضرت عثمان اور ان کی طرف منسوب شدہ قرآن پر سے ان الزامات کے رفع ہو جانے کا امکان نہ تھا؟ کیا اس صورت میں اگر ایک معترض کے دل میں مذکورۂ بالا احادیث کی بناء پر شبہہ پیدا ہوتا اور وہ تحقیق کے خیال سے ان کی جستجو چاہتا تو اسے اطمینان حاصل کر لینے کا ایک بہترین ذریعہ نہ موجود ہوتا؟ یقیناً اس وقت ایک ادارۂ تحقیق کے لئے بہترین صورت یہ تھی کہ وہ اس قرآن کی مطابقت کر کے ان تمام شکوک سے نجات پا جائے جو موجودہ قرآن کے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔ پھر جب ایسا نہ ہوا اور بڑی کاوش کے ساتھ اس قرآن کو دنیا سے نابود کرنے کا انتظام کیا گیا تو کیا یہ صورت مذکورۂ بالا روایات کے مفاد کو زیادہ تقویت نہیں پہنچاتی اور اس طرح شکوک و شبہات کے دامن کو وسیع سے وسیع تر نہیں بناتی۔

قرآن میں کتابت کی غلطیاں

ملاحظہ ہو حافظ شام جلال الدین سیوطی کی کتاب (اتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۸۳۔ ۱۸۴)

قال ابو عبید فی فضائل القرآن حدثنا ابو معاویة عن هشام بن عروة عن ابیه قال سألت عائشة عن لحن القرآن عن قوله تعالیٰ ان هذا لساحران وعن قوله تعالیٰ والمقیمین الصلوٰة والموتون الزکوٰة وعن قوله تعالیٰ انّ الذین آمنوا والّذین هادوا والصابئون فقالت یا ابن اختی هذا عمل الکتّاب اخطئوا فی الکتاب۔ هذا اسناد صحیح علی شرط الشیخین۔

”عروۃ بن زبیر کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ سے قرآن کی موجودہ غلطیوں کے متعلق سوال کیا جو ان آیات میں ہیں۔ ان هذا لساحران والمقیمین الصلوة والموتون الزکوة۔ ان الّذین آمنوا والذین هادوا والصابئون ۔ انھوں نے فرمایا اے فرزند خواہر یہ کاتبوں کی کارستانی

ہے، انھوں نے کتابت میں غلطی کی۔ سند اس روایت کی ان شرائط کے مطابق جو شیخین (بخاری و مسلم) نے قرار دیئے ہیں صحیح ہے۔

دوسری روایت

قال (ابوعبید) حدثنا حجاج عن هرون بن موسى اخبرنی الزبير بن الحريث عن عكرمة قال لما كتبت المصاحف عرضت على عثمان فوجدت فيها حروفا من اللّحن فقال لا تغيّروها فان العرب ستغيرها او قال ستعرّب بالسنتها لو كان الكاتب من ثقيف والمملى من هذيل لم توجد فيه هذه الحروف اخرجه ابن الانبارى فى كتاب الرد على من خالف مصحف عثمان وابن اشته فى كتاب المصاحف ثم اخرج ابن الانبارى نحوه من طريق عبدالاعلى بن عبدالله بن عامر وابن اشته نحوه من طريق يحيیٰ بن يعمر۔

عکرمہ کا بیان ہے کہ جب مصاحف لکھے گئے اور حضرت عثمان کے سامنے پیش ہوئے تو ان میں بعض حروف غلط نظر آئے، عثمان نے فرمایا کہ اب انھیں تغیر نہ دو۔ عرب اہل زبان خود انھیں (سمجھ کر) تغیر دے لیں گے۔ یا یوں کہا کہ وہ لوگ اپنے محاورہ کے مطابق خود بنالیں گے۔ اگر لکھنے والا قبیلۂ ثقیف سے اور بولتا جانے والا قبیلہ ہذیل سے ہوتا تو یہ غلطیاں پائی نہ جاتیں۔ اس روایت کو ابن انباری نے اپنی کتاب میں اور ابن اشتہ نے کتاب المصاحف میں بھی دو دو طریقوں سے درج کیا ہے۔

تیسری روایت

اخرج (ابن الانبارى) من طريق ابى عشر عن سعيد بن جبير انه كان يقرأ والمقيمين الصلوة ويقول هو لحن من الكتاب۔

سعید بن جبیر والمقیمین الصلوٰۃ کو پڑھ کر کہتے تھے کہ یہ کاتبوں کی غلطی ہے۔

اب کچھ نہ پوچھو کہ ان روایات کو نقل کرنے کے بعد کیا ہلچل مچی ہے۔ کوئی کہتا ہے ''یہ احادیث تو بڑے مشکل ہیں، بھلا صحابہ نحوی غلطی کر سکتے ہیں۔ ان کے تو گھٹی میں فصاحت پڑی ہوئی تھی، ان سے غلطی کا امکان کہاں ہے۔

(کون کہے وہ ایسے فصیح اللسان تھے کہ ایک محاورہ سے دوسرے محاورے پر ان کی زبان نہیں پلٹتی تھی اسی لئے سات حرفوں کی ضرورت ہوئی اور پھر آخری دور میں فتوحات ایران کے بعد سے زبان پر اتنا اثر پڑا تھا کہ علم نحو کے وضع کی ضرورت محسوس ہوئی۔)

اور پھر خصوصیت سے قرآن مجید کو تو انھوں نے رسالتمآبؐ سے تنزیل کے مطابق حاصل کیا تھا اور اس کو پوری احتیاط کے ساتھ حفظ کر لیا تھا۔ پھر اس میں غلطی کیونکر کرتے۔

(عام صحابہ کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ انھوں نے قرآن کو رسالت مآبؐ سے حاصل کیا تھا، رہ گئے مخصوص لوگ جنھوں نے رسولؐ سے حقیقۃً قرآن اخذ کیا تھا وہ مذکورۂ بالا الفاظ پر متفق نہ تھے بلکہ ان میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ تفسیر خازن بغدادی مطبوعۂ مصر، ج ۲، ص ۶۲ میں ہے۔)

والصابئون ظاهر الاعراب يقتضي ان يقال والصابئين و كذا قرأة ابي بن كعب وابن مسعود وابن كثير من السبعة ''صابئون ترکیب نحوی کا اقتضاء بظاہر یہ ہے کہ والصابئین ہو اور ابی بن کعب و ابن مسعود اور قراء سبعہ میں سے ابن کثیر اسی طرح پڑھا کرتے تھے'')

پھر یہ کیسے خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ سب غلطی پر مجتمع ہو گئے تھے اور ان کو اس کے بعد خیال بھی نہ آیا کہ وہ اس کی اصلاح کرتے۔

(اہو ہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو دو سو نہ معلوم کتنے کاتب تھے جن کا اجتماع خطا پر محال ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ چار سے زیادہ نہ تھے، کتابت کی غلطی سے کوئی عالم و فاضل فصیح بلیغ مستثنٰی نہیں ہے۔ پہلے کاتب سے غلطیاں ہوئیں دوسروں نے اسی کا اتباع کیا۔ لکھتے وقت لکھنے والے کی توجہ زیادہ تر نقل نویسی کی طرف اس طرح منعطف ہوتی ہے کہ اس کو اکثر الفاظ کے معانی کا تصوّر بھی نہیں ہوتا اور پھر جبکہ پہلی کتابت کے ساتھ حسن ظن بھی اتنا ہو کہ منظور یہ ہے کہ دوسرا نسخہ اس کے بالکل مطابق ہو اور ایک شوشہ کا اختلاف نہ ہونے پائے جس کی تصدیق اس رسم الخط سے ہوتی ہے جو قرآن کی کتابت میں رائج ہے۔ حالانکہ اس میں بعض چیزیں یقینا قواعد کتابت کے خلاف ہیں جیسے لا اذ بحنّه اور لا اوضعوا وغیرہ مگر کیا مجال کہ کاتبانِ قرآن اس الف کو ترک کر دیں۔) پھر یہ کیونکر گمان کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمان اس کے تغیر دینے سے منع کرتے۔

(کسی کتاب کی تصحیح کے وقت خصوصاً جبکہ تعجیل مدنظر ہو اس امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ایسی غلطیاں جن کا اندازہ مطالعہ کرنے والوں کو ذرا وقت سے ہوتا ہے دور کر دی جائیں لیکن ایسی صریحی غلطیاں جن کو ہر شخص دیکھ کر سمجھ سکتا ہے ترک کر دی جاتی ہیں کہ دیکھنے والا خود ہی ان کی تصحیح کر لے گا۔ حضرت عثمان کے جواب میں یہی خیال مضمر معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ان غلطیوں کی تصحیح کی ضرورت نہیں۔ عرب اہل زبان ہیں وہ خود ان کا احساس کر کے انھیں اپنے محاورہ کے مطابق درست کر لیں گے لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ عام افراد اہل اسلام پر ان کے اور ان کے مامور کردہ جامعین قرآن کے ساتھ حسن ظن کچھ ایسا غالب آجائے گا کہ وہ اس کو تو اس کو جو اس سے زیادہ معمولی غلطیاں ہیں جیسے لا اذبحنّہ کا الف اس کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رکھ کر ابتدائی جمع قرآن کی یاد تازہ رکھیں گے۔)

پھر کیونکر گمان ہو سکتا ہے کہ قرأت اسی غلطی کے موافق باقی رہی حالانکہ وہ برابر تواتر کے ساتھ نقل ہوتا رہا ہے۔ (یہ اسی صورت سے باقی رہی کہ جیسے املاء کی غلطیاں برابر باقی رہیں اور وہ تواتر کے ساتھ اب تک موجود ہیں۔) یہ ایسی بات ہے جو عقلاً اور شرعاً اور عادۃً محال ہے۔ (غور کرنے کی ضرورت ہے ورنہ مذکورۂ بالا وجوہ واسباب اور نظائر کو دیکھتے ہوئے وہ کسی حیثیت سے محال نہیں ہے۔)

کوئی کہتا ہے کہ یہ روایات ضعیف السند ہیں قابل عمل نہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ لحن سے مراد وہ مقامات ہیں جہاں رمز و کنایہ کے طور پر مطالب ذکر ہوئے ہیں۔ کسی کا مقولہ ہے کہ غلطیوں سے مراد املاء کی غلطیاں ہیں۔ جیسے لا اذبحنّہ وغیرہ اور ان کے تصحیح کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن علامۂ سیوطی نے ان جوابات کے نقل کرنے کے بعد لکھ دیا ہے هذه الاجوبة لا يصلح منها شيئ عن حديث عائشة اما الجواب بالتضعيف فلان اسناده صحيح كما ترى واما الجواب بالرمز وما بعده فلان سؤال عروة عن الاحرف المذكورة لا يطابقه۔

''ان جوابوں میں سے کوئی بھی حضرت عائشہ کی حدیث کے متعلق صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ سند اس کی صحیح ہے لہٰذا ضعف سند کا بہانہ ہو نہیں سکتا اور رمز و اشارہ والے جواب کا بھی موقع نہیں کیونکہ اس میں عروہ کا سوال خاص آیات کے متعلق ہے جن میں اعراب کی غلطیوں کو ظاہر کیا گیا تھا۔''

ابن اشتہ کہتے ہیں کہ مراد حضرت عائشہ کی یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرأت سبعہ میں سے موجودہ

قرأت کے انتخاب میں غلطی کی ہے نہ یہ کہ جو موجودہ قرأت ہے وہ بالکل غلط اور ناجائز ہے۔''

لیکن سوال و جواب پر نظر ڈالنے سے یہ تاویل بالکل پادرہوا ثابت ہوتی ہے عروہ بن زبیر نے مذکورہ بالا آیات میں غلط اعرابی کے متعلق سوال کیا تھا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ **هذا عمل الكتابة**۔ یہ کاتبوں کی کارستانی ہے اگر موجودہ الفاظ بھی حروف سبعہ میں سے ہوتے اور حروف سبعہ کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہیں تو وہ کاتبوں کی کارستانی نہیں کہے جاسکتے بلکہ وہ بھی خدا کی نازل کردہ ہیں۔ اس کے متعلق یہ جواب کافی تھا کہ یہ بھی بعض لغات عرب میں محاورہ ہے اور اس بناء پر حروف سبعہ میں سے ایک حرف کے مطابق ہے اور پھر انتخاب قرأت میں غلطی یہ جامع قرآن یا اختیار کنندہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کو کاتبوں کی طرف منسوب کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

بعض نے گھبرا کر آیات مذکورہ کی توجیہ کے لئے سیبویہ واخفش وخلیل وغیرہ کو اکٹھا کرنا اور کلیات ابوالبقاء کو الٹنا شروع کر دیا ہے اور مندرجہ الفاظ کی توجیہ کے لیے نحویین کے اقوال واحتمالات سے مدد لی ہے لیکن افسوس ہے کہ ان اقوال وتوجیہات میں سے کوئی بھی حضرت ام المومنین عائشہ کی روایت کا درمان نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت ان تاویلات میں حضرت ام المومنین کے ارشاد کی تکذیب اور ان کی خدمت میں سوءادب مضمر ہے۔ کیا وہ معظّمہ قواعد عرب اور اصول نحو سے واقف نہ تھیں یا وہ جان بوجھ کر حضرت عثمان کی عداوت میں صحیح الفاظ کو غلط بتلا رہی تھیں؟

درحقیقت یہ قواعد واصول تو بعد میں ایجاد ہوئے ہیں اور اکثر خود قرآن مجید کے آیات کو دیکھ کر اور ان سے استفادہ کر کے اور حضرت ام المومنین عائشہ اپنی ذاتی اطلاع کی بناء پر الفاظ مذکورہ کو غلط نویس کاتبوں کی کارستانی بتلا رہی تھیں پھر موصوفہ کے قول کے سامنے نحویین کے توجیہات پیش کرنے سے کیا نتیجہ؟

چوتھی روایت، تحریف کا صریحی اقرار

الامام احمد فی مسنده و ابن اشته فی المصاحف من طریق اسماعیل المکی عن ابی خلف مولیٰ بنی جمح انه دخل مع عبید بن عمیر علیٰ عائشة فقال جئت اسالك عن آیة فی کتاب الله تعالیٰ کیف کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقرأها قالت ایّة آیة قال الذین یاتون ما اتوا والذین یوتون ما آتوا قالت ایتها احب الیك قلت

والّذی نفسی بیدہ لاحدھما احب الیّ من الدنیا جمیعا قالت ایّھما قلت الذین یاتون ما اتوافقالت اشھد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذلك كان یقرأھا و کذلك انزلت ولکن الھجاء حرّف۔

امام احمد بن حنبل نے مسند میں اور ابن اشتہ نے کتاب المصاحف میں اسماعیل مکی کے طریق سے ابو خلف جمحی سے روایت کی ہے کہ وہ عبید بن عمیر کی معیت میں حضرت عائشہ کے پاس گئے اور کہا کہ اس آیت کے متعلق دریافت کرنے آیا ہوں کہ رسالتمآبؐ اس کو کیونکر پڑھا کرتے تھے ''الّذین یاتون ماٰ اتوایا الذین یؤتون ماٰ اتواٗ؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ تمہیں زیادہ کیا اچھا معلوم ہوتا ہے انھوں نے کہا الذین یاتون ما اتوا معظّمہ نے فرمایا میں گواہی دیتی ہوں کہ میں نے جناب رسالتمآبؐ کو اسی طرح پڑھتے سنا اور وہ اسی طرح نازل ہوئی تھی لیکن حروف ہجاء میں الفاظ کے تحریف کردی گئی ہے۔

پانچویں روایت

ابن جریر وسعید بن منصور فی سننہ من طریق سعید بن جبیر عن ابن عباس فی قولہ حتیٰ تستأنسوا و تسلّموا قال انما ھی خطأ من الکاتب حتیٰ تستأذنوا و تسلّموا۔

ابن عباس کا بیان ہے کہ حتی تستأنسوا وتسلّموا کاتب کی غلطی ہے۔ اصل یوں ہے کہ حتیٰ تستاذنوا و تسلموا۔

چھٹی روایت

ابن انباری نے بطریق عکرمہ ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی افلم یتبین الذین آمنوا ان لو یشاء اللہ لھدی الناس جمیعاً کسی نے کہا مصحف میں تو یوں ہے کہ افلم یئیس الذین آمنوا الخ ابن عباس نے کہا اظن الکاتب کتبھا وھوناعس میرا خیال یہ ہے کہ کاتب نے اس جملہ کو پینک میں لکھا ہے۔

ساتویں روایت

سعید بن منصور من طریق سعید بن جبیر عن ابن عباس انہ کان یقول فی

قوله تعالیٰ وقضی ربك انما ھی ووصّٰی ربك التزقت الواو بالصّاد۔

ابن عباس اس آیت کے متعلق کہ وقضی ربك کہتے تھے یہ اصل میں ووصّٰی ربك تھا کتابت میں واو صاد سے متصل ہو گیا۔

ابن اشتہ نے اس کو بایں الفاظ نقل کیا ہے کہ استمدّ الکاتب مدادا کثیرا فالتزقت الواو بالصاد۔

''کاتب نے روشنائی قلم میں زیادہ لے لی جس کی وجہ سے واؤ صاد سے متصل ہو گیا۔''

آٹھویں روایت

ابن اشتہ نے ضحاک سے روایت کی ہے کہ انھوں نے قرآن میں اس آیت کو نکال کر کسی کے سامنے پیش کیا کہ تم اسے کیونکر پڑھتے ہو؟ اس نے کہا وقضی ربك ''ضحاک نے کہا کہ ہم تو اس طرح نہیں پڑھتے اور نہ ابن عباس بلکہ اصل میں یہ ووصی ربك ہے اور یونہی وہ ہمیشہ پڑھی اور لکھی جاتی تھی (یعنی حضرت عثمان والے جمع قرآن کے قبل) لیکن کاتب نے روشنائی قلم میں زیادہ لے لی جس سے واؤ صاد سے متصل ہو گیا جس طرح خدا نے فرمایا ہے ولقد وصینا الذین اوتوا الکتاب من قبلکم وایاکم ان اتقوا اللہ۔ اور بھلا اگر خداوند عالم کے قضاؤ قدر میں گذر جاتا کہ لوگ عبادت کریں تو کوئی اس کے قضا کی مخالفت کب کر سکتا ہے بلکہ یہ درحقیقت ہدایت ہے جو اس نے بندوں کو کی ہے۔''

نویں روایت

سعید بن منصور وغیرہ من طریق عمر بن دینار عن عکرمۃ عن ابن عباس انہ کان یقرأولقد آتینا موسیٰ وھرون الفرقان ضیآء و یقول خذوا ھذہ الواو واجعلوھا ھٰھنا والذین قال لھم الناس ان النّاس قد جمعوا الکم الایۃ۔

''ابن عباس اس آیت کو پڑھتے تھے کہ ولقد آتینا موسیٰ وھرون الفرقان ضیآء اور کہتے تھے کہ اس واؤ کو یہاں سے اٹھا کر اس جگہ رکھ دو کہ'' والذین قال لھم الناس انّ الناس قد جمعوا الکم''۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ولقد آتینا والی آیت کے شروع میں واؤ زیادہ اور الّذین قال لھم

الناس میں واوکم ہے۔

دسویں روایت

ابن عباس کا بیان ہے کہ مثل نورہٖ کمشکوۃ میں کاتب سے غلطی ہوئی ہے، خدا کی شان اس سے بلند ہے کہ اس کے نور کی مثال مشکوۃ ہو بلکہ اصل یہ آیت اس طرح تھی کہ مثل نور المومن کمشکوۃ ابن اشتہ نے ان تمام اخبار کو نقل کر کے کہا ہے کہ ان سے مراد وہی تعیین قرأت میں غلطی ہے نہ یہ کہ جو کچھ موجود ہے وہ غلط اور نا قابل عمل ہے لیکن افسوس ہے کہ روایات کے الفاظ اس تاویل سے بہت دور ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ قلم میں روشنائی زیادہ آگئی واؤ صاد سے مل گیا جس کی بناء پر ووصیٰ کا وقضیٰ ہوگیا۔ یہ فرماتے ہیں کہ یعنی تعیین قرأت میں غلطی ہوئی وہ فرماتی ہیں کہ حروف آیت میں تحریف ہوئی، انکا ارشاد ہے یعنی تعیین قرأت میں غلطی ہوئی وہ کہتے ہیں کہ وقضیٰ ربک غلط ہے اس لئے کہ قضاء کے بعد تخلف کیسا؟ یہ کہتے ہیں یعنی وہ بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے لیکن مقام تعیین میں اس کا انتخاب کرنا غلطی تھی۔

کیا تاویلات ایسے ہی ہونا چاہئیں جن سے الفاظ بہت شدت سے انکار رکھتے ہوں۔

ابن انباری نے ان روایات کے خلاف قدح کا حربہ تیز کیا ہے اور سب کا جواب یہی دیا ہے کہ وہ ضعیف السند ہیں لہٰذا قابل اعتبار نہیں مگر یہ ایسا جواب ہے کہ حافظ سیوطی بھی اس سے راضی نہیں اور وہ ان دونوں جوابوں کے نقل کے بعد فرماتے ہیں والجواب الاوّل اولیٰ واقعد ”پہلا جواب بہتر اور زیادہ دل نشین ہے۔“

لیکن ہم نے پہلے جواب کی حقیقت واضح کردی، اب رہی تضعیف وہ اس کثرت اسناد اور تعدد روایات کی بناء پر جو استفاضہ کی حد سے بڑھ گئی ہے اعتناء کی مستحق نہیں ہے۔

قرآن میں تغیر وتبدیل اور بالفاظ دیگر تحریف

قال(ابو عبید)حدثنا حجاج عن ابن جریج اخبرنی ابن ابی حمید عن حمیدۃ بنت ابی یونس قالت قرأعلیّ ابی وھو ابن ثمانین سنۃ فی مصحف عائشۃ انّ اللہ و ملئکتہٗ یصلّون علیٰ النّبی یا ایھا الّذین آمنوا صلّوا علیہ وسلّموا تسلیما وعلی الذین

یصلّون الصفوف الاول قالت قبل ان یغیّر عثمان المصاحف۔

حمیدہ بنت ابی یونس کا بیان ہے کہ میرے سامنے ابی بن کعب نے جب کہ وہ کبیر السن اسّی برس کی عمر کے تھے مصحف عائشہ میں یہ آیت اس طرح پڑھی تھی کہ ان اللّٰہ وملئکتہٗ یصلون علیٰ النبی یا ایھا الذین آمنوا صلّوا علیہ وسلّموا تسلیما وعلیٰ الذین یصلّون الصفوف الاول۔ کہا یہ اس وقت کا ذکر ہے کہ جب تک حضرت عثمان نے مصاحف میں تغییر وتبدیل نہیں کی تھی۔

روایت سے صاف ظاہر ہے کہ وعلی الذین یصلون الصفوف الاول کا فقرہ جناب عائشہ کے مصحف میں موجود تھا اور حضرت عثمان نے مصاحف میں تغییر وتبدیل فرمائی تھی۔ اس کے ساتھ تحریف وتغییر کی نوعیت بتلائی نہیں گئی اور یہ کہ اس کا اثر احکام الٰہیہ پر پڑا تھا یا نہیں؟

بیشک علامہٴ سیوطی نے اس خبر کو نسخ تلاوت کے ذیل میں درج کیا ہے لیکن یہ ایک خیال ہے جس کا وزن خطا اجتہادی سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر آیت منسوخ التلاوۃ ہوتی تو حضرت عائشہ اس کو اپنے مصحف میں کیوں باقی رہنے دیتیں حالانکہ ان معظّمہ کا ساتھ جناب رسالتمآبؐ کا آخری وقت تک رہا تھا لہٰذا عرضہٴ اخیرہ کی خبر ان سے بڑھ کر کس کو ہو سکتی تھی؟ اور ابی بن کعب اس کو کیوں تلاوت کرتے جبکہ وہ اقرأ الصحابہ اور بنص حضرت عمر سید القراء تھے اور پھر حضرت عثمان کی طرف اس تغییر کی نسبت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ زید بن ثابت کے پہلی مرتبہ جمع قرآن کرنے میں موجود تھی اور نیز اس لئے کہ اگر زید والے قرآن میں نہ ہوتی تو حضرت عائشہ کا مصحف اس پر مشتمل نہ ہوتا۔

کیونکہ مصحف حضرت عائشہ اس جمع قرآن کے موقع پر موجود نہ تھا اور نہ حضرات شیخین کو اس کاوش کی ضرورت نہ پڑتی اور نہ قراء کے قتل ہونے سے اس کے تلف کا خوف پیدا ہوتا بلکہ یقیناً یہ مصحف اس کے بعد لکھا گیا ہے اور چونکہ وہ صحف حضرت ابوبکر ہی کے پاس موجود تھے اور وہی ان کے جمع وتدوین کے بانی تھے اور حضرت عائشہ کے کتابت مصحف کے وقت کسی خاص جمع وتدوین کا پتہ بھی نہیں ہے اس بناء پر یقینا حضرت عائشہ کا مصحف انہی صحف کی مطابقت سے تھا۔ پھر اگر وہ منسوخ التلاوۃ تھی تو عرضہٴ اخیرہ میں حاضر ہونے

۱۔ اتقان سیوطی، ج ۲، ص ۲۵

والے زید بن ثابت ہی اس کو قرآن میں درج کیوں کرتے جو نوبت حضرت عثمان تک پہونچتی اور انھیں اس تغییر وتبدیل کی ضرورت محسوس ہوتی۔

قرآن کا کثیر حصّہ تلف

حدّثنا ابن ابی مریم عن ابی لهیعة عن ابی الاسود عن عروۃ بن الزبیر عن عائشة قالت کانت سورۃ الاحزاب تقرأ فی زمن النبی صلّی الله علیه وسلم مائتی ایة فلما کتب عثمان المصاحف لم یقدر منها الّا ما هو الاٰن۔

عروہ بن زبیر حضرت عائشہ کی زبانی ناقل ہیں کہ آپ فرماتی تھیں سورۂ احزاب جناب رسالت مآبؐ کے زمانہ میں دوسو آیتوں کا پڑھا جاتا تھا لیکن جب حضرت عثمان نے مصاحف کو لکھا تو انھیں نہ مل سکا مگر اتنا ہی کہ جواب موجود ہے۔

اس روایت کے الفاظ کو بھی نسخ تلاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے کہ حضرت عائشہ بقیہ حصہ کے عدم اندراج کی وجہ عجز وقصور اور دستیاب نہ ہوسکنے کو قرار دیتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافی جستجو کی گئی کہ اگر کچھ اور آیات اس سورہ کے متعلق دستیاب ہوں تو وہ درج کئے جائیں لیکن اس سے زیادہ نہ مل سکے۔ اگر اس حصّہ کے متعلق معلوم ہوتا کہ وہ منسوخ التلاوۃ ہے۔

تو زید بن ثابت صاحب عرضۂ اخیرہ اس امر پر مطلع ہوتے اور ان آیات کو ڈھونڈھنے جستجو کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تاکہ نتیجہ میں یاس وحرمان سے دوچار ہونا پڑے بلکہ وہ آیات اگر سامنے موجود ہوتے تب بھی درج نہ کئے جاتے لہٰذا درج نہ کئے جانے کا سبب یہ بتلانا کہ وہ دستیاب نہ ہوسکے اس امر کی صریحی دلیل ہے کہ وہ آیات منسوخ التلاوۃ نہ تھے بلکہ اگر دستیاب ہوتے تو ضرور درج کرنے کے قابل تھے۔

یہ خیال کہ کسی آیت کا صحابہ کے ذہن سے نکل جانا اور ان کا اسے فراموش کر دینا یہی اس کے منسوخ التلاوہ ہونے کی سند ہے واقعیت سے کوسوں دور ہے۔

انسان عجز وقصور کا مجسمہ اور اس کی طبیعت نقائص کا مجموعہ ہے، سہو ونسیان اس کے فطری عوارض میں

۱۔ اتقان، صفحۂ مذکورہ

سے ہے جو طویل عرصہ تک بے توجہی اور عدم مزاولت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس کی ذمہ داری خداوند عالم پر عائد کرنا غلط ہے۔

صحیح بخاری سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نسیان سے رسالتمآبؐ بھی مستثنیٰ نہ تھے چنانچہ اس میں ''باب نسیان القرآن ''میں یہ حدیث موجود ہے۔ حدّثنا احمد بن ابی رجآء قال حدثنا ابو اسامة عن هشام بن عروة عن ابيه عن عائشة قالت سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم رجلا يقرا فی سورة بالليل فی المسجد فقال يرحمه الله لقد اذكرنی كذا و كذا اية كنت انسيتها من سورة كذا و كذا۔

''حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے ایک شخص کو شب کے وقت ایک سورہ پڑھتے سنا حضرت نے فرمایا خدا اس پر رحمت نازل کرے اس نے مجھ کو فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں سورہ کی یاد دلا دیں جن کو میں بھول گیا تھا۔''

اور اس مضمون کی متعدد حدیثیں اس باب میں اور ''باب من لم يرباسا ان يقول سورة البقرة وسورة كذا ''میں مذکور ہیں۔ پھر جب رسالتمآبؐ کا نسیان بعض آیات کو ان آیات کے منسوخ التلاوۃ ہونے کی دلیل نہ ہوا اور نہ رسالتمآبؐ ان آیات کے یاد آجانے پر اظہار مسرت نہ فرماتے تو کسی اور کا نسیان وہ نسخ تلاوت کی دلیل کب ہوسکتا ہے؟

اور پھر تلف کے اسباب سہو و نسیان میں منحصر نہیں بلکہ دوسری صورتیں بھی تھیں جن میں سب سے اہم حفاظ قرآن کا لڑائیوں میں شہید ہو جانا ہے۔ جس کی بناء پر حضرت عمر کو قرآن مجید کی جمع آوری کا خیال پیدا ہوا تھا چنانچہ اتقان، ج۱ص۵۹ میں ہے۔

اخرج ابن ابی داؤد من طريق الحسن ان عمر سأل عن آية من كتاب الله فقيل كانت مع فلان قتل يوم اليمامة فقال انا لله وامر بجمع القرآن۔

''حسن کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے ایک آیت کے متعلق دریافت کیا، معلوم ہوا کہ وہ فلاں صحابی کے پاس تھی جو جنگ یمامہ میں قتل ہو گئے، یہ سن کر آپ نے (متاسفانہ) کہا

۱۔ مطبوعہ کرزن پریس، ص ۷۵۳

انّا للہ وانّا الیہ راجعون اور جمع قرآن کا مشورہ دیا۔“

علامہ سیوطی اس روایت کے متعلق فرمائیں کہ مقطوع الاسناد ہے لیکن وہ اس کو کیا کریں گے کہ اس کا مضمون صحیح بخاری کی اس حدیث سے بالکل موافق ہے جس میں حضرت عمر کا گھبرا کر حضرت ابوبکر کی خدمت میں آکر کہنا مذکور ہے کہ غضب ہوگیا روز یمامہ بہت سے حفاظ قرآن مار ڈالے گئے اور اگر اسی طرح دو تین لڑائیوں میں حفاظ قرآن کام آئے تو کثیر حصہ قرآن کا ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حفاظ قرآن کی شہادت سے آپ کو کثیر مقدار میں قرآن مجید کے تلف کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا، کیا اس صورت سے جو اجزائے قرآن تلف ہوں وہ بھی منسوخ التلاوۃ سمجھے جائیں گے تو پھر حضرت عمر کو فکر ہی کیا تھی؟ جتنے آیات منسوخ ہونے والے تھے وہ تلف ہوجاتے اور جو کچھ باقی رہتا وہی مکمل قرآن سمجھا جاتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ درحقیقت اس قسم کے حوادث سے قرآن مجید کی اصلیت پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا اور نہ ان کو نسخ تلاوۃ سے کوئی تعلق ہے۔

دوسری روایت

قال ابو عبید حدثنا اسمٰعیل بن ابراھیم عن ایوب عن نافع عن ابن عمر قال لیقولنّ احدکم قد اخذت القراٰن کلّہ وما یدریہ ما کلّہ قد ذھب منہ قرآن کثیر ولکن لیقل قد اخذت ما ظھر۔

”حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ تم میں سے ہر شخص کہتا ہوگا کہ میں نے پورا قرآن حاصل کرلیا۔ حالانکہ اسے کیا معلوم پورا قرآن کیا چیز ہے، اس میں تو اکثر حصہ تلف ہوگیا ہے، بیشک یہ کہنا چاہئے کہ قرآن میں سے جتنا ظاہر ہوا اس کو میں نے لے لیا ہے۔“(۱)

وہ نسخ تلاوت والا وار جو ہر روایت کے متعلق منجا ہوا ہے اگرچہ ہمیشہ خالی جاتا ہے بھلا اس روایت کے مقابل کیونکر نہ ہوتا چنانچہ فوراً ذھب منہ قرآن کثیر کے معنی کہہ دیئے گئے کہ یعنی اکثر حصہ اس کا منسوخ التلاوۃ ہوگیا ہے لیکن معنی شناس افراد اس تاویل کی سبک باری کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

۱۔ اتقان، ج ۲، ص ۲۵

ایک تو منسوخ التلاوۃ ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ آیت بحکم الٰہی قرآن سے خارج کردی گئی پھر اس کی بناء پر اس ممانعت کے کوئی معنی نہیں کہ قرآن کامل موجود ہونے کا اپنے پاس ادعا نہ کرو، حضرت عبداللہ بن عمر ایسے فقیہ کی طرف اس بے بنیاد حکم کی نسبت قابل تسلیم نہیں ہے۔

پھر اس کے مقابلہ میں یہ کہنے کی ہدایت کہ **قد اخذت منہ ما ظھر** نسخ تلاوت پر منطبق نہیں ہے اس لئے کہ ظہور مقابل خفاء ہے اور خفاء وجود پر موقوف یعنی اکثر حصہ قرآن کا مخفی رہا اور ہم تک نہ پہونچ سکا جو کچھ پہونچا وہ ہم نے لے لیا، نسخ بمعنی ازالہ ہے اور اس کا مقابل بقاء ہے نہ ظہور، بیشک یہ کہنا اس صورت میں صحیح تھا کہ **قد اخذت منہ ما بقی**۔

پھر ذہاب کے معنی کو نسخ تلاوت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ذہاب کی لفظ وہی ہے جو حدیث جمع قرآن میں حضرت عمر کی زبانی باین الفاظ مذکور ہے۔

انّی اخشیٰ ان یستحرّ القتل بالقرآء فی المواطن فیذھب کثیر من القران

۔''مجھ کو خوف ہے کہ لڑائیوں میں حفاظ اسی صورت پر مارڈالے جائیں تو بہت سا قرآن ہاتھ سے جاتا رہے۔''

یہاں ذہاب کے معنی تلف کے سوا کچھ اور نہیں اور یہ لفظ اسی عبارت کے ساتھ عبداللہ بن عمر کے قول میں مذکور ہے وہ فرماتے ہیں۔ **قد ذھب منہ قرآن کثیر** لہٰذا اس کے بھی معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ بہت سا قرآن ہاتھ سے جاتا رہا یعنی تلف ہو گیا ہے۔

مذکورۂ بالا تصریحات کے نتائج

مذکورۂ بالا تمام بیانات سے حسب ذیل نتیجہ برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید رسالتمآبؐ کے زمانہ میں جمع نہ ہوا تھا بلکہ وہ متفرق کاغذ کے پرزوں پتھر کے ٹکڑوں اور اسی قسم کی چیزوں پر درج تھا۔

(۲) رسالت مآبؐ کی وفات کے بعد جبکہ ایک کثیر جماعت حفاظ قرآن میں کی قتل ہو چکی اس وقت جمع قرآن کا خیال پیدا ہوا۔

(۳) جمع و ترتیب کا کام ذاتی اعتماد کی بناء پر انفرادی حیثیت سے زید بن ثابت کے سپرد کردیا گیا اور اس طرح اس کی تمام ذمہ داری صرف زید کی طرف عائد قرار پائی ہے۔

(۴) زید بن ثابت دو گواہوں کی تصدیق کے بعد آیت کو درج کرتے تھے۔اس سے ان آیات کے تواتر کو صدمہ پہنچتا ہے اور نیز وہ آیات درج ہونے سے رہ گئے جن پر شہادت عدلین حاصل نہ تھی لہٰذا اس مجموعے کے مکمل ہونے کا یقین کیونکر ہو؟

(۵) قرآن کا نظم و نسق اصلی ترتیب قرآن سے بالکل مخالف ہے۔سوروں میں آگے کا پیچھے اور پیچھے کا آگے اور نیز آیات میں مقدم کا موخر اور موخر کا مقدم ہو گیا ہے۔

(۶) قرآن مجید سات حرفوں پر نازل کیا گیا تھا جس کے اعتبار سے صحابہ کی قرأت میں بھی اختلاف تھا لیکن حضرت عثمان نے چھ حرفوں کو ساقط کر کے تمام صحابہ کو ایک ہی قسم کی قرأت کا پابند بنا دیا۔

(۷) موجودہ قرآن میں بتصریح حضرت عائشہ وابن عباس وغیرہ کتابت کی غلطیاں پائی جاتی تھیں جن کی اصلاح نہ ہو سکی اور وہ اسی غلط صورت پر حد تواتر کو پہونچ گیا۔

(۸) مصاحف قرآنیہ میں تغییر و تبدیل ہو گئی تھی جس کے مقامات کا علم بھی نہیں ہے۔

(۹) قرآن سے کثیر حصہ ساقط ہو گیا ہے اور مکمّل قرآن موجود نہیں ہے۔

اب ان نتائج کے مطابق جن میں سے ایک حرف بھی میرا طبعزاد نہیں ہے اور نہ یہ ضروری ہی ہے کہ میں ان تمام سے متفق ہوں بلکہ وہ تمام ان احادیث و روایات کا لب لباب ہے جو مستند جوامع حدیث و کتب برادران اہل سنت میں مذکور ہیں کیا ایمان بالقرآن کا دعویٰ عقل و منطق کی رو سے حق بجانب ہے؟

معیار اعتبار پر ایک عمیق نظر ڈالو اور ان روایات کو اس پر منطبق کرو!

پہلا جزو یہ کہ ''کسی جزء میں بھی تحریف و تغییر کا یقین کیسا احتمال بھی نہ ہو۔''

ان روایات سے رخصت ہو گیا جن میں صاف طور پر اس قرآن میں تغییر و تبدیل اور اغلاط کتابت اور حذف و اسقاط کا اعتراف کیا گیا ہے۔

دوسرا جزو یہ تھا کہ ''اگر تحریف و تغییر کا وجود ثابت ہو تو مستند وجوہ کی بناء پر ان مقامات کی تعین ہو جہاں وہ تغیر ہوا ہے یا ان مطالب کی نوعیت معلوم ہو کہ جن کا اسقاط عمل میں آیا ہے اور باقی کے متعلق کوئی قطعی ضمانت ہو جو اس کے کلام الٰہی اور واجب العمل ہونے کی دلیل ہو۔'' لیکن یہاں ایسا بھی نہیں، حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ کثیر حصہ قرآن کا ہاتھ سے جاتا رہا لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ وہ کثیر حصہ آیات قصص و مواعظ

وغیرہ میں کا تھا یا آیات احکام؟

اور اس کے ساقط ہو جانے سے موجودہ آیات کے معانی و مطالب پر کچھ اثر پڑا یا نہیں اس لئے کہ اکثر ایک آیت کے معنی میں دوسرے آیات کے ضمیمہ سے عظیم انقلاب پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

اسی طرح حضرت ام المومنین عائشہ نے یہ فرمادیا کہ سورۂ احزاب دوسو آیتوں سے زیادہ تھا مگر ان آیات کی نوعیت کچھ نہ بتلائی۔ اس تحریف و تغییر اور حذف و اسقاط کی اجمالی اطلاع سے کیا ہر ہر جز و مشکوک نہ ہوگا اور پھر جبکہ موجودہ باقی حصہ کی صحت کے لئے کوئی قطعی دلیل بھی تسلیم شدہ عقائد کی بناء پر موجود نہیں ہے اس لئے کہ فرزندانِ اسلام کی اکثریت نے رسولؐ کے بعد کسی معصوم شخص کے وجود کو ضروری نہیں سمجھا ہے جو اسلام و آثار اسلام کا حقیقی محافظ ہو بلکہ وہ تمام اشخاص کو جائز الخطاء سمجھتے ہیں اور جائز الخطاء اشخاص کا نتیجۂ عمل قطعی طور پر خطاء کے احتمال سے بلند نہیں ہو سکتا لہٰذا اب برہانی حیثیت سے ایمان بالقرآن کا مستند کیسا رہ جاتا ہے؟ کچھ نہیں!

لیکن باوجود اس کے میں اس امر کا حق نہیں رکھتا کہ کسی کے ایمان بالقرآن کی نفی کروں اور نہ جیسا کہ تمہید میں کہہ چکا ہوں میں نے اس مقصد کے لئے قلم اٹھایا ہے۔

ہمارے سواد اعظم کے پاس ایک بنیاد موجود ہے جس پر وہ ایمان بالقرآن کی عمارت قائم کر سکتے ہیں اور وہ حسن ظن صحابۂ کرام کے ساتھ ہے، یہ وہ مضبوط اساس ہے جس پر خلافت ایسے اہم مسئلہ کی بنیاد قرار پائی ہے چنانچہ عضد الدین ایجی نے کتاب مواقف میں حضرت علیؑ کی افضلیت کے ادلّہ نقل کرنے کے بعد بسلسلۂ جواب حسب ذیل عبارت تحریر فرمائی ہے۔

نحن وجدنا السلف قالوا انّ الافضل ابوبکر ثم عمر ثم عثمان ثم علی وحسن الظن بھم یقتضی ان لم یعرفوا لم یطبقوا علیہ فوجب علینا اتباعھم فی ذلك القول و تفویض ما ھو الحق الی اللہ۔

”ہم نے صدر الاسلام کے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے پایا کہ افضلیت بترتیب خلافت ہے اور حسن ظن ان لوگوں کے ساتھ اس امر کا مقتضی ہے کہ اگر وہ اس امر کو پورے طور پر سمجھ نہ لیتے تو کبھی اس پر متفق نہ ہوتے لہٰذا ہم پر اس قول میں ان کا اتباع لازم ہے اور واقعا حق کیا ہے اس کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔“

شارح مواقف نے بھی اس قول میں ان سے اختلاف نہیں کیا ہے۔

اب جتنی بھی عقلی ونقلی دلیلیں پیش کی جائیں ان سب کے مقابلہ میں حسن ظن صحابہ کے ساتھ کافی ہے اور وہی ایمان بالقرآن کا واحد مستند ہوسکتا ہے اور بس۔

قرآن مجید کے متعلق شیعی نقطۂ نظر

اس میں شبہہ نہیں کہ جوامع حدیث میں ایسے روایات موجود ہیں جن سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید اصلی صورت پر باقی نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ نہ کچھ تغیر وتبدل پیدا ہوا ہے لیکن اس کی نوعیت کیا ہے اس میں یہ احادیث سب ایک ہی نقطہ پر مجتمع نہیں ہیں بلکہ ان کے مفاد میں اختلاف ہے اور اس طرح یہ روایات چند اقسام کے تحت میں مندرج ہوجاتے ہیں ۔جن کو فہرست وار درج کرتے ہوئے کہیں کہیں علم رجال کے معیار پر سند کی تحقیق بھی کرتے جائیں گے۔

پہلی قسم

دو روایات جن سے صرف اختلاف ترتیب کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن ترتیب نزول کے مطابق نہیں ہے۔

(۱)عن احمد بن علی القرشی عن محمد بن الفضیل عن ابی حمزۃ الثمالی عن ابی جعفر علیہ السلام قال ما احد من ھذہ الامۃ جمع القراٰن کما انزل بہ جبرئیل علیہ السلام علی محمّد الا وصی محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم۔

ابوحمزۂ ثمالی نے امام محمد باقرؑ سے نقل کیا ہے کہ حضرت نے فرمایا کسی شخص نے اس امت میں سے قرآن کو اس طرح جمع نہیں کیا کہ جس طرح اس کو جبرئیل نے رسالتمآبؐ پر نازل کیا تھا مگر وصی رسول (علیؑ) نے

(۲)محمد بن یحییٰ عن احمد بن محمد عن ابن محبوب عن عمرو بن ابی المقدام عن جابر قال سمعت ابا جعفر علیہ السلام یقول ما ادّعی احد من الناس انہ جمع القراٰن کلہ کما انزل الا کذّاب وما جمعہ وحفظہ کما نزّلہ اللہ الّا علی بن ابی طالب

۱۔ ملاحظہ ہو شرح مواقف مطبوعۂ لکھنؤ ص ۷۴۳۔۷۴۴

والایمة من بعدہ۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ کوئی شخص عام لوگوں میں سے اس بات کا ادعا نہ کرے گا کہ ''اس نے قرآن کو جس طرح خدا نے نازل کیا تھا اس صورت پر حفظ کیا ہے مگر یہ کہ وہ دروغ گو ہوگا۔ اس کو اس صورت پر نہیں حفظ کیا مگر علی بن ابی طالبؑ نے اور ایمہ نے کہ جو آپ کے بعد تھے۔

اس روایت کو ثقة الاسلام ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینیؒ نے اصول کافی میں اور محمد بن حسن صفار نے بصائر الدرجات میں درج کیا ہے۔ ان دونوں حدیثوں کے مفاد پر نظر کی جائے تو وہ اتقان سیوطی والی اس روایت سے بالکل مطابق ہے جس میں عکرمہ سے دریافت کیا گیا ہے کہ **الّفوہ کما انزل الاوّل فالاوّل** ''کیا صحابہ نے قرآن کو جس طرح خدا نے نازل کیا تھا اسی صورت پر سلسلہ وار جمع کیا تھا۔'' اور عکرمہ نے کہا ہے کہ

لو اجتمعت الانس والجنّ علی ان یولفوہ ھذا التالیف ما استطاعوا۔

اس صورت سے تو اگر تمام جن وانس بھی جمع ہوتے قرآن مجید کو جمع نہ کر سکتے تھے۔''

بیشک اس مقولہ کی تعمیمی حیثیت میں جس تنگ نظری و کوتاہ بینی کا مظاہرہ موجود تھا اس کی ان دونوں روایتوں میں استثنائی جملہ سے اصلاح کردی گئی ہے۔

ان دونوں روایتوں سے ظاہر ہے کہ امیر المومنینؑ کے ترتیب دادہ قرآن میں یہ امر مخصوص تھا کہ وہ کیفیت ترتیب میں عنوان نزول کے مطابق تھا اور اسی کے موافق علمائے اہلسنت کے روایات سابق میں ذکر ہو چکے ہیں۔

دوسری خصوصیت وہ ہے جس کا تذکرہ احتجاج طبرسی کی ایک طویل روایت کے ذیل میں ہوا ہے کہ

''**فلمّا رأی علی علیہ السلام غدرھم و قلة وفائھم لزم بیته واقبل علی القرآن یولفه ویجمعه فلم یخرج حتیٰ جمعه کله فکتبه علی تنزیله والناسخ والمنسوخ۔**

''جب امیر المومنینؑ نے لوگوں کی بے اعتنائی کا مشاہدہ کیا تو اپنے گھر میں گوشہ نشینی اختیار فرمائی اور قرآن مجید کی جمع وتالیف میں مشغول ہو گئے اور اس وقت تک گھر سے باہر تشریف نہ لائے جب تک کہ اس کو پورا جمع نہ کرلیا اور اس کو ترتیب نزول کے مطابق ناسخ ومنسوخ کے ساتھ تحریر کیا۔''

اسی کے مطابق محمد بن سیرین کی روایت تاریخ الخلفاء سیوطی میں بھی موجود ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے ترتیب نزول کے مطابق مرتب ہونا قرآن کا خود ایک حد تک ناسخ ومنسوخ کی تعیین کا ذمہ دار ہے اس لئے کہ مقدم کا مؤخر اور مؤخر کا مقدم ہوجانے کی صورت میں یقینا اگر خارجی روایات سے معلوم نہ ہوتو ناسخ ومنسوخ میں اشتباہ ہوجانا ناگزیر ہے۔ مثلاً یہی کہ جب انسان قرآن میں تعیین عدۂ وفات کی آیت واربعة اشهر و عشرا کو پہلے اور متاعا الی الحول والی آیت کو بعد دیکھ رہا ہے تو کیوں نہ یہ سمجھے گا کہ ایک سال مقرر کرنے والی آیت ناسخ اور چار مہینہ دس دن کی آیت منسوخ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ممکن ہے کہ جناب امیرؑ کے قرآن میں تفسیری حواشی کے طور پر ناسخ ومنسوخ کی تعیین بھی کر دی گئی ہو اور اسی لئے محمد بن سیرین نے کہا ہے کہ لو اصیب ذلك الكتاب كان فيه العلم'' اگر وہ قرآن لوگوں کے ہاتھ میں پڑ جاتا تو ایک بڑا علمی ذخیرہ دستیاب ہوتا۔(۱)

دوسری قسم

وہ احادیث جن سے قرآن موجود میں اجمالی طور پر کمی پائے جانے کا پتہ چلتا ہے مثلاً (۱) عن علی بن الحکم عن هشام بن سالم قال سألت ابا عبدالله علیه السلام عن سورة الاحزاب فقال كانت مثل سورة البقرة مثلها و مثل ثلثيها۔

''ہشام بن سالم نے امام جعفر صادقؑ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ سورۂ احزاب بقرہ کا اتنا نہیں تو اس کے دو ثلث کے برابر تھا۔''

(۲) عن القسم بن الایادی عنه صلوات الله علیه قال كانت سورة الاحزاب سبعمائة آية۔

ارشاد ہوا ہے کہ سورۂ احزاب میں سات سو آیتیں تھیں۔

(۳) عن سماعة عن ابی بصیر قال قلت لابی جعفر علیه السلام انّ الناس یقولون قد ذهب من سورة الاحزاب شیئی کثیر قال سبحان الله ما ذهب ففيه قلت این هو قال هو والله عندنا۔

۱۔ تاریخ الخلفاء، ص ۱۸۴

ابوبصیر کا بیان ہے کہ میں نے امام محمد باقرؑ کی خدمت میں عرض کی لوگ کہتے ہیں کہ سورۂ احزاب میں سے کثیر حصہ تلف ہوگیا۔ آپ نے فرمایا جو کچھ تلف شدہ کہا جاتا ہے وہ موجود ہے۔ میں نے کہا کہاں فرمایا ہمارے پاس ان روایات کے بالکل مطابق حضرت ام المومنین عائشہ کا بیان اتقان سیوطی سے سابق میں درج ہو چکا ہے اور اس کے متعلق کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ لیکن احمد بن محمد سیاری جن کی کتاب ان احادیث کا ماخذ ہے ان کے متعلق شیخ الطائفہ نے فہرست میں لکھا ہے۔ **ضعیف الحدیث فاسد المذهب مجفوا لروایة کثیر المراسیل** اور علامہ نے فرمایا ہے۔ کثیر المراسیل اور نجاشی نے بھی کہا ہے **فاسد المذهب** اور کشی کی روایت ہے کہ امام محمد تقیؑ نے اس شخص پر اظہار بے اعتمادی کیا تھا۔ فاسد المذہب کی لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص مذہبی حیثیت سے فرقۂ شیعہ سے تعلق نہ رکھتا تھا اس لئے اس کے روایات کی ذمہ داری ہم پر عائد کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

(۴) عن محمد بن یحیی عن احمد بن محمد عن علی بن الحکم عن هشام بن سالم عن ابی عبدالله علیه السلام قال ان القرآن الّذی جآء به جبرئیل الیٰ محمّد صلی الله علیه واله سبعة عشر الف اٰیة۔

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ وہ قرآن جو جناب رسالت مآبؐ پر نازل ہوا تھا اس میں ستر ہزار آیتیں تھیں اس روایت کو بیشک کلینیؒ نے کافی میں درج کیا ہے لیکن سلسلۂ سند ذکر کر کے ذمہ داری کو اپنے اوپر سے ہٹا دیا ہے اور باخبر مطالعہ کرنے والے کے لئے تحقیق رجال کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔

اس روایت کا استناد بھی احمد بن محمد سیاری کی جانب ہے جن کے متعلق اس کے قبل روشنی ڈالی جا چکی ہے اور پھر خود سیاری کی کتاب میں محدث نوری کے بیان کے مطابق عشرۃ الف آیۃ یعنی دس ہزار آیتوں کا ذکر ہے اور کافی کے بعض نسخ میں سبعۃ الاف یعنی صرف سات ہزار آیتیں ہیں اور ملا محسن فیض کاشانی نے وافی میں جو اس حدیث کو اصول کافی سے نقل کیا ہے تو اس میں یہ لفظ سبعۃ الاف ہی درج ہے اس اختلاف نسخ اور اضطراب متن کے باوجود کہاں وثوق ہوسکتا ہے کہ امام علیہ السلام نے کیا تعداد بتلائی تھی۔

اور پھر روایت سے صریحی طور پر نقص ثابت بھی نہیں ہوتا اس لئے کہ آیات کی تحدید فواصل کے اعتبار سے مقرر کی گئی ہے اور وسط آیات میں اکثر مقامات پر وقف لازم اور وقف جائز وغیرہ کے علامات مختلف

صورتوں میں پائے جاتے ہیں جو قراء کے اختلافات کا نتیجہ ہیں اور جن میں قرّ اء سب ایک نقطہ پر مجتمع بھی نہیں ہیں تو کیا نہیں ممکن کہ فواصل کی شناخت اور ابتداء واختتام کی تعیین میں فروگذاشت ہوئی ہو اور اس لحاظ سے آیات کی تعداد میں اختلاف پیدا ہو جائے اور یہی اس روایت کا مفاد ہو۔

تیسری قسم

وہ روایات جن سے خاص خاص آیات میں بعض مخصوص الفاظ کی تغییر وتبدیل اور کمی کا پتہ چلتا ہے جنھیں محدث نوری نے فصل الخطاب میں سلسلہ وار درج کیا ہے اور ان میں سے اکثر اگرچہ سیاری کے روایات ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب القرائت میں جس کا دوسرا نام ''التنزیل والتحریف'' ہے۔درج کئے ہیں اور در حقیقت محدث نوری کو فصل الخطاب لکھنے کا زیادہ شوق اسی کتاب کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا اس لئے کہ اس کتاب کا موضوع ہی شروع سے آخر تک یہی ہے اور سیاری کے درجۂ اعتبار کی حقیقت اس کے قبل کھل چکی ہے۔لیکن ان روایات میں ایسے بھی احادیث ہیں کہ جو دیگر جوامع حدیث میں مختلف طرق واسانید سے مذکور ہیں۔

ان روایات میں اکثر ایسے اختلافات کا پتہ ہے جو صرف الفاظ کے طریق استعمال سے تعلق رکھتے ہیں اور جن سے معنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور ان کی اہمیت اس اختلاف سے زیادہ نہیں ہے کہ جو قراء سبعہ کی ساتوں مشہور قرأتوں میں عام کتب تفسیر وقرأت میں مذکور ہے مثلاً

صراط الذین انعمت علیهم کے بجائے
صراط من انعمت علیهم

ولا الضالین	وغیر الضالین
اهدنا الصراط المستقیم	اهدنا السراط المستقیم
مالك یوم الدین	ملك یوم الدین

اور بعض روایات وہ ہیں کہ جن میں مختلف آیات قرآن میں بعض الفاظ کے کم ہونے کا پتہ دیا گیا ہے جیسے۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا (فی علی) فاتو بسورۃ من مثلہ فبدّل الّذین ظلموا (اٰل محمد حقھم) قولا غیر الذی قیل لھم فانزلنا علی الذین ظلموا (اٰل محمد حقھم) رجزا۔

بئسما اشتروا بہ انفسھم ان یکفروا بما انزل اللہ (فی علی) بغیا۔ واذا قیل لھم آمنوا بما انزل اللہ (فی علی) قالو انؤمن بما انزل علینا۔ وغیرہ ان روایات کے متعلق اکثر محققین کا یہ خیال ہے کہ اس قسم کے الفاظ تفسیر وتاویل کے طور پر تھے جو بیان مراد کے لئے جبرئیل امین کے توسط سے جناب رسالتمآبؐ تک پہونچائے جاتے تھے اور رسالتمآبؐ کی طرف سے اگرچہ موقع بموقع ان کے مفاد کا اظہار ہو جایا کرتا تھا لیکن تعلیم قرآن میں عام طور پر صحابہ کو ان تفاسیر کے بتلانے کی ضرورت نہ تھی اور وہ حضرتؐ کے پاس اور حضرت کے بعد ان کے وارث علم کے پاس محفوظ تھے۔

امیر المومنینؑ نے جو قرآن جمع کیا تھا وہ ان تاویلات کو بھی اپنے اندر لئے ہوئے تھا جو تفسیری حواشی کے طور پر درج کئے گئے تھے اور اس کی تصدیق اس روایت سے ہوتی ہے جو احتجاج طبرسی میں حضرت امیر المومنینؑ کی زبانی ایک زندیق کے جواب میں وارد ہوئی ہے اس میں حضرت نے فرمایا ہے۔

ولقد جئتھم بالکتاب کملا مشتملا علی التاویل والتنزیل والمحکم والمتشابہ والناسخ والمنسوخ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ قرآن صرف متن قرآن پر مشتمل نہ تھا بلکہ اس میں تاویل وتنزیل اور محکم ومتشابہ اور ناسخ ومنسوخ سب کا بیان مندرج تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے تنزیل سے بھی مراد متون الفاظ قرآن نہیں ہیں بلکہ تنزیل سے مراد قرآن کا اصلی مورد نزول ہوا کرتا ہے یعنی وہ معنی جس کے ظاہر کرنے کے لئے خاص طور پر وہ آیت نازل ہوئی ہے اور تاویل اس کے لوازم اور وہ موارد ہیں جن پر تعمیمی حیثیت سے اس آیت کا انطباق ہے یا باطنی طور پر ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کے ثبوت میں میرے پیش نظر اصول کافی کی حدیث طویل ہے جو ”باب فیہ نکت ونتف من التنزیل فی الولایۃ“ میں درج ہے۔ جس میں سائل نے مختلف آیات قرآن کے معانی دریافت کئے ہیں اور اکثر معانی کے بتلانے پر سائل نے دریافت کیا ہے کہ یہ تنزیل ہے یا تاویل اور

حضرت نے کہیں فرمایا ہے تنزیل ہے اور کہیں تاویل۔

محمد بن الفضیل عن ابی الحسن الماضی علیہ السلام قال سألته عن قول الله عزوجل یریدون لیطفئوا نور الله بافواههم قال یریدون لیطفئوا ولایة امیرالمومنین بافواههم قلت والله متم نوره قال والله متم الامامة لقوله عزوجل الذین آمنوا بالله ورسوله والنور الذی انزلنا فالنور هوالامام قلت هوالّذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق قال هوالذی امر رسوله بالولایة لوصیّه والولایة هی دین الحق قلت لیظهر علی الدین کلّه قال یظهره علی جمیع الادیان عند قیام القائم قال یقول الله والله متم ولایة القائم ولو کره الکافرون بولایة علی قلت هذا تنزیل قال نعم اما هذا الحرف فتنزیل واما غیره فتاویل۔

محمد بن فضیل نے امام رضاؑ سے سوال کیا کہ اس آیت کے کیا معنی ہیں۔یریدون لیطفئوا نور الله بافواههم حضرت نے فرمایا یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ولایت امیرالمومنینؑ کو محو کردیں والله متم نوره یعنی خدا امامت کے مسئلہ کو پورا کرنے والا ہے۔هوالذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق۔یعنی خدا نے اپنے رسول کو مامور کیا تبلیغ ولایت پر اور ولایت ہی دین حق ہے لیظهره علی الدّین کلّه۔یعنی قیام حضرت حجت (عج) کے وقت وہ تمام ادیان پر غالب آجائے گا۔اور خداوند عالم نے یہ فرمایا ہے کہ خدا ولایت حضرت حجت (عج) کو تمام کرے گا اگر چہ ولایت علیؑ کے منکر اس کو پسند نہ کریں۔سائل نے پوچھا کہ یہ جو آپ نے فرمایا تنزیل ہے؟ یعنی اصلی مورد نزول آیت ہے حضرت نے فرمایا ہاں جو میں نے کہا وہ تو تنزیل ہے۔اور اس کے علاوہ جو دوسری چیزیں ہوں وہ تاویل میں داخل ہیں۔

پھر لمّا سمعنا الهدیٰ اٰمنّا کے متعلق ارشاد ہوا الهدی الولایة اٰمنّا بمولانا فمن آمن بولایة مولاه فلا یخاف بخسا ولا رهقا "ہدیٰ سے مراد ولایت ہے تو جو شخص اپنے مولا کی ولایت پر ایمان لایا اس کو کچھ خوف نہ کرنا چاہیئے۔سائل نے پوچھا تنزیل" یہ تنزیل ہے؟ فرمایا لا تاویل" نہیں یہ تاویل ہے اور اسی صورت پر حضرت نے بعض معانی کو تنزیل فرمایا ہے اور بعض کو تاویل یہاں تک کہ سب کے آخر میں جو بہت صریح ہے وہ یہ ہے کہ سائل نے پوچھا هذا الّذی کنتم به تکذبون کے

کیا معنی ہیں؟ حضرت نے فرمایا یعنی امیر المومنین اس سے مراد امیر المومنین ہیں۔سائل نے پوچھا تنزیل ''یہ تنزیل ہے؟ حضرت نے فرمایا ''ہاں''

''یعنی امیر المومنین'' کی لفظ کے صاف یہ معنی ہیں کہ امیر المومنین کی لفظ جزو آیت نہیں ہے بلکہ **هذا الذى** کی لفظ سے مراد و مقصود ہے اس پر سائل کا یہ پوچھنا کہ یہ تنزیل ہے یا تاویل اور حضرت کا فرمانا تنزیل ہے اس کی صاف دلیل ہے کہ تنزیل بھی معانی کے قبیل سے ہے نہ الفاظ سے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ تنزیل سے مراد وہ تفسیر ہو جو خداوند عالم کی جانب سے الفاظ قرآن کے ساتھ نازل ہوئی تھی اور تاویل وہ تفسیر ہے جو غیر نازل شدہ ہے لیکن الفاظ کی مراد اصلی ہے اور اس صورت میں یہ حدیث اس دعوے کا صریحی شاہد ہوگا کہ قرآن مجید کے ساتھ بعض الفاظ شرح کے طور پر بھی نازل ہوئے تھے کہ جو حقیقۃ متن قرآن کا جز و نہیں لیکن منزّل من اللہ ضرور تھے۔

اور جب تنزیل بھی تفسیر کے قبیل سے ہوگئی تو اب ان روایات کے بھی معنی دوسری صورت پر ظاہر ہوں گے جن میں یہ ہے کہ امیر المومنینؑ نے قرآن کو اس کی تنزیل پر جمع کیا جیسے سلمان کی روایت جس کو کتاب سلیم بن قیس ہلالی اور احتجاج طبرسی میں نقل کیا گیا ہے اور اس میں یہ ہے کہ **فكتبه على تنزيله والناسخ والمنسوخ** اس کے بھی معنی یہ ہیں کہ حضرت نے قرآن کو اس تفسیر کے مطابق تحریر کیا جو حضرت اقدس الٰہی کی جانب سے الفاظ کے لئے بتوسط جبرئیل پہنچائی گئی تھی۔

اور احتجاج کی سابق روایت سے یہ معلوم ہوا کہ اس میں تنزیل کے ساتھ تاویل بھی مذکور تھی اور در حقیقت اگر خود ان الفاظ کی نوعیت پر نظر کی جائے جن کا اضافہ روایات مذکورہ میں آیات قرآن کے ساتھ کیا گیا ہے اور آیات کے موجودہ الفاظ کے ساتھ ان کے جوڑ کا لحاظ کیا جائے تو کچھ نوعیت بھی ان الفاظ کی تفسیر ہی کی سی نظر آتی ہے اور ذوق وسلیقہ کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جز و متن نہیں ہیں لطف یہ ہے کہ یہی روایت احتجاج کی جس میں امیر المومنینؑ والے قرآن کے تاویل وتنزیل دونوں پر مشتمل ہونے کا تذکرہ ہے ان اشخاص کا مایۂ ناز مستند ہے جو شیعوں کے عقیدۂ تحریف کو رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں حالانکہ جب اس سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ امیر المومنینؑ کا قرآن متون الفاظ قرآن کے ساتھ تاویل وتفسیر کے اوپر بھی مشتمل تھا تو اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ اس میں جس قسم کے نقص وتغیر کا پتہ دیا گیا ہے وہ اصلی الفاظ قرآن سے تعلق رکھتا ہے؟

اور پھر جبکہ اس میں دوسرے الفاظ بھی اسی کے مؤید موجود ہیں۔

درحقیقت روایت مذکورہ سے قطعی طور پر جو کچھ نکلتا ہے وہ دو چیزیں ہیں۔ایک تحریف معنوی یعنی معانی وتاویلات قرآن میں تغیر وتبدیل جو مختلف آیات قرآن میں ہمیشہ کی گئی اور کی جاتی ہے اور دوسرے ترتیب قرآن کا بگڑنا یعنی ایک جگہ کی آیت کا دوسری جگہ ہونا چنانچہ ہم مخصوص طور پر ان فقرات کی شرح درج کرتے ہیں جنھیں مخالف حلقوں کی جانب سے بطور دلیل پیش کیا جاتا رہا ہے۔

پہلا فقرہ

ثمّ دفعهم الاضطرار بورود المسائل عمّا لا یعلمون تاویله الیٰ جمعه و تالیفه و تضمینه من تلقائهم ما یقیمون به دعائم کفرهم فصرّح منادیهم من کان عنده شیئ من القرآن فلیأتنا به ووکلوا تالیفه و نظمه الیٰ بعض من وافقهم الیٰ معاداة اولیاء الله فالّفه علی اختیارهم۔

''پھر (امیر المومنینؑ کے ترتیب دادہ قرآن کے واپس کرنے کے بعد) جب ایسے آیات کے متعلق سوالات پیدا ہوئے جن کی تاویل سے وہ واقف نہ تھے تو ان کو ضرورت پڑی کہ اس کی جمع وتالیف کریں اور اس کو اپنے دل سے ایسے معانی کا جامہ پہنائیں جن کے ذریعہ سے ان کی حق پوشی کے ستون قائم ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کے منادی نے آواز دی کہ جس کے پاس کوئی حصہ بھی قرآن کا ہو وہ لے کر ہمارے پاس آئے اور اس کی تالیف وترتیب کو بعض ایسے اشخاص کے سپرد کیا۔ جو دوستانِ خدا (اہلبیت) کی مخالفت میں ان کے موافق تھے اور انھوں نے اس کو اپنی صوابدید کے مطابق مرتب کیا۔''

الفاظ قرآن کے حذف، اسقاط اور تغیر وتبدیل کے ساتھ تاویل سے ناواقفیت کو کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ مذکورۂ بالا عبارت میں اس کاہش وکاوش کا سبب غیر معلوم التاویل آیات کے متعلق سوال پیدا ہونے کو قرار دیا گیا ہے۔لہٰذا یقیناً **تضمینه من تلقائهم ما یقیمون به دعائم کفرهم** کے معنی وہی ہیں جن کو ہم نے ترجمہ میں ملحوظ رکھا ہے یعنی تضمینہ کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے جو الفاظ کے قبیل سے ہے اور مایقیمون کے اسم موصول سے معنی مراد ہیں اور مقصود یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ قرآن کو اپنے دل سے (اگرچہ حقیقۃً وہ متضمن نہیں ہیں) ایسے ایسے معانی پر متضمن قرار دیا جن سے ان کی حق پوشی کے ستون محکم ہوتے

ہیں۔

اب کوئی بتلائے کہ اس کو الفاظ قرآن میں زیادتی وکمی سے کیا تعلق ہے؟

دوسرا فقرہ

انّ الکنایة عن اسماء ذوی الجرائر العظیمة من المنافقین لیست من فعله تعالیٰ وانّھا من فعل المغیّرین والمبدّلین الّذین جعلوا القران عضین واعتاضوا الدّنیا من الدین۔

بڑے بڑے جرم کرنے والے منافقوں کے ناموں کو صرف کنایہ کے طور پر ذکر کرنا خدا کا کام نہیں ہے (کیونکہ اس نے تو تفسیری حواشی میں ان کے اسماء کو صاف طور پر ذکر کر دیا تھا) یہ تو ان تغییر وتبدیل کرنے والوں کا نتیجۂ کار ہے جنھوں نے قرآن کو مبہم بنا دیا اور دنیا کو دین کے عوض میں حاصل کیا۔"

کیا اس میں کوئی شبہہ ہے کہ اگر وہ تفاسیر جو خداوند عالم نے آیات قرآن کے ساتھ بطور خود نازل کئے تھے آج محفوظ ہوتے تو قرآن فہمی کے لئے وہ روشنی ہاتھ آتی جس کے بعد شک وشبہہ کا امکان نہ رہتا۔

تیسرا فقرہ

والّذی بدا فی الکتاب من الارآء علی النبی صلی الله علیه وآله من فریة الملحدین۔"۔ یہ جو کتاب الٰہی کے اندر بادی النظر میں رسالتمآبؐ کے خلاف شان باتیں نظر آتی ہیں۔ یہ صحیح راستہ سے ہٹ جانے والوں کی تراش کا نتیجہ ہیں (کہ انھوں نے صحیح تاویلات کو چھوڑ کر نئے نئے معانی اپنے دل سے تراش لئے۔)

چوتھا فقرہ

وامّا ظھورك علیٰ تناکر قوله فان خفتم الّا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ماطاب لکم من النسآء ولیس یشبه القسط فی الیتامیٰ نکاح النسآء فھو مما قدّمت ذکرہ من اسقاط المنافقین من القرآن وبین القول فی الیتامیٰ وبین نکاح النساء من الخطاب والقصص اکثر من ثلث القرآن وھذا وما اشبھه مما ظھرت حوادث المنافقین فیه لاھل النظر والتأمل و وجد المعطلون واھل الملل

المخالفین للاسلام مساغا الی القدح فی القرآن۔

آیت قرآن ''فان خفتم الّا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحو ما طاب لکم'' کے متعلق جو اعتراض ہے اس کا منشاء درحقیقت ظاہر دار افراد کا درمیان کی آیتوں کو ہٹا دینا ہے۔ اور یتامیٰ والے فقرہ اور نکاح نساء کے درمیان میں ثلث قرآن سے زیادہ خطاب وقصص وغیرہ تھے۔ اور یہی اور اس کی ایسی دوسری چیزیں وہ ہیں جن میں ان لوگوں کی کارستانی اہل نظر وفکر کو معلوم ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے مخالفین اسلام کو قرآن مجید پر اعتراض کا موقع ملتا ہے۔''

اب بتلاؤ کہ متفرق پرزوں اور پتھر کے ٹکڑوں میں سے اگر دو فقرے ایسے ملے جن میں سے در حقیقت ایک اول قرآن کا اور ایک آخر قرآن کا تھا۔ لیکن ناواقفیت کی جہت سے ان کو ملا کر درج کر دیا گیا۔ تو کیا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان دونوں میں پورے تیس پاروں کا فاصلہ تھا اور وہ فاصلہ ان کے درمیان میں سے ساقط کر دیا گیا؟ کیا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تیس پارے اب کہیں ہیں ہی نہیں اور ناقص ہو گئے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ پارے اس کے قبل اور بعد متفرق طور پر درج کئے گئے ہیں۔ لیکن ترتیب کی خرابی سے ان دو آیتوں کا افتراق اتصال سے بدل گیا، پھر امام کا یہ فرمانا کہ ان دونوں آیتوں میں ثلث قرآن سے زیادہ کا فاصلہ تھا اور وہ فاصلہ اب ساقط ہو گیا کیونکر اس امر کی دلیل ہوگا کہ وہ ثلث قرآن قرآن کے اندر ہی سے حذف ہو گیا اور اب موجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ ممکن ہے کہ دوسرے مقامات پر متفرق طور سے موجود ہو۔ درحقیقت اس فقرہ سے سوائے اختلاف ترتیب کے کوئی نتیجہ نکالا نہیں جا سکتا۔

ترتیب کے اختلاف ہی کی بدولت نقص وزیادتی کا اطلاق بھی قرآن میں صحیح ہو جاتا ہے اس لئے کہ جس مقام کی آیت ہٹا کر دوسرے مقام پر لیجائے گی وہ پہلے مقام سے ناقص اور دوسرے مقام پر زائد ہو گئی اور اس طرح

پانچواں فقرہ

بھی حل ہو جاتا ہے کہ زادوا فیہ ما ظھر تنا کرہ و تنافرہ' اس میں (موقع بموقع) ایسے جملہ زیادہ ہو گئے جن کی اجنبیت (اس مقام سے جہاں وہ بڑھائے گئے ہیں) اور مغایرت (اسی مقام سے) ظاہر ہے۔''

ان تشریحات کے ساتھ ہمیں اس روایت کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ وَاِلَّا قرآن مجید میں زیادتی کا قول جو ظاہر بین افراد کو اس روایت سے سمجھ میں آتا ہے وہ سلف وخلف کے متفقہ اقوال اور اجماع امامیہ کے خلاف ہے اور یہی اس روایت کے نا قابل اعتبار سمجھے جانے کا کافی مستند ہے اور پھر درصورتیکہ اس کی کوئی اطمینان بخش کیسی غیر اطمینان بخش سند بھی نہیں ہے یعنی علامۂ طبرسی نے اس کو بغیر کسی اسناد کے مرسل طور پر نقل کیا ہے۔''

رہ گیا ان کا دیباچہ میں یہ کہہ دینا کہ میں ان روایات کو نقل کروں گا جو میری نظر میں مستند اور قابل وثوق ہیں یہ کسی صورت سے اس روایت کے اعتبار کی دلیل نہیں ہوسکتا اس لئے کہ ان کی نظر میں کسی روایت کا قابل اعتبار ہونا اس کو محققانہ میزان پر قابل اعتبار نہ بنادے گا ورنہ تحقیق رجال اور علم درایت و روایت کا دروازہ بالکل بند ہوجاتا اور علماء کے روایات تحقیق رجال سے مستغنی سمجھے جاتے حالانکہ تحقیق شیوہ علمائے شیعہ نے تو اصول کافی کے احادیث کو بھی جرح وتعدیل کے موازنہ سے بلند نہیں قرار دیا ہے اور وہ اس کی روایت کو بھی بغیر تحقیق قبول نہیں کر لیتے پھر احتجاج طبرسی کی روایت کا جو بغیر کسی سند کے ہو کیا وزن سمجھا جاسکتا ہے؟؟!

چوتھی قسم

وہ روایات جن میں اجمالی طور سے تحریف کا پتہ دیا گیا ہے لیکن تحریف کی نوعیت ان سے ظاہر ہوجاتی ہے جیسے احتجاج کی روایت جو ابوذر غفاریؓ سے منقول ہے ان کا بیان ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے انتقال کے بعد امیر المومنینؑ نے قرآن جمع کیا اور مہاجرین وانصار کے مجمع میں لا کر پیش کیا **فلما فتحه ابو بكر خرج فی اوّل صفحة فتحها فضائح القوم خوثب عمر وقال یا علی اردوه فلا حاجة لنافیه فاخذه علیؑ علیه السلام وانصرف ثم احضر زید بن ثابت وکان قاریا للقرآن فقال له عمر ان علیّا جاء نا بالقرآن وفیه فضائح المهاجرین والانصار وقد راینا ان نؤلف القرآن ونسقط منه ما کان فضیحة وهتکا للمهاجرین والانصار فاجابه زید الیٰ ذلك** ۔ حضرت ابوبکر نے جو اس کو کھولا تو سب سے پہلے وہی مقام نکلا جہاں فضائح قوم مذکور تھے۔ بس حضرت عمر نے آگے بڑھ کر کہا کہ یا علیؑ اس کو آپ واپس لے جایئے ہم کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت علیؑ نے اس کو لے لیا اور واپس گئے۔ پھر حضرت ابوبکر نے زید بن ثابت کو بلوایا اور حضرت عمر نے ان

سے کہا کہ علیؑ ہمارے پاس قرآن لائے تھے جس میں بہت سے مہاجرین وانصار کی نسبت رسوا کن باتیں ہیں۔اب ہماری رائے قائم ہوئی ہے کہ ہم خود قرآن کو جمع کریں اور اس میں جو کچھ مہاجرین وانصار کے معائب ہوں۔ان کو حذف کردیں۔زید نے ان کے حکم کو منظور کیا۔"

(۲) عن العیاشی عن الصادق علیه السلام لو قرأ القران کما انزل لألفیتمونا فیه مسمّین"۔اگر قرآن اس طرح پڑھا جاتا جس طرح نازل ہوا تھا تو ہمارے اسماء اس میں مذکور پاتے۔"

(۳) عن النعمانی عن امیرالمومنین علیه السلام کانی بالعجم فساطیطهم فی مسجد الکوفة یعلّمون الناس القران کما انزل قلت یا امیرالمومنین الیس هو کما انزل فقال لامحی منه سبعون من قریش۔

نعمانی نے امیرالمومنینؑ سے نقل کیا ہے کہ گویا میں (زمانۂ حضرت حجت میں) عجموں کے خیمے مسجد کوفہ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم اس صورت پر دے رہے ہیں جس طرح وہ نازل ہوا تھا۔ راوی نے عرض کیا یا امیرالمومنین کیا وہ صورت نزول پر نہیں ہے۔فرمایا نہیں اس میں سے ستر آدمیوں کے قریش میں سے نام نکال ڈالے گئے ہیں۔"

اور اسی قبیل کے روایات جن میں سے اکثر مراسیل اور ضعاف ہیں لیکن تعدد و تکثر کی بناء پر ان کے اجمالی مفاد کا ثابت ہو جانا بعید نہیں ہے کہ کہیں کہیں پر سے ایسے اسماء و تصریحات جو سیاست وقت کے خلاف تھے حذف و اسقاط کی نذر ہوئے۔لیکن ان روایات میں بھی اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ تصریحات متن قرآن کا جزو تھے بلکہ یہ توجیہ کہ وہ تصریحات معنائے تنزیلی کے قبیل سے تھے ان روایات میں بھی کافی گنجائش رکھتی ہے۔

علماء میں اتفاق و اختلاف

قرآن مجید کے متعلق دو جزو ایسے ہیں جو علمائے شیعہ میں نقطۂ اتفاق ہیں ایک یہ کہ قرآن مجید میں زیادتی نہیں ہوئی ہے اور موجودہ قرآن کلام الٰہی اور وحی آسمانی ہے۔دوسرے یہ کہ قرآن کی ترتیب اصلی سلسلۂ نزول کے مطابق نہیں ہے اور اس میں تقدیم و تاخیر ہوئی ہے۔لیکن اس کے بعد کسی اور قسم کی تحریف کے

متعلق علماء کا نقطۂ خیال مختلف ہو گیا ہے۔

بہت سے بڑے علماء اور رؤسائے ملت تحریف کے بالکل منکر ہیں اور قرآن موجود میں کسی جزو کے بھی اسقاط اور تغییر و تبدیل کو تسلیم نہیں کرتے جن میں سے بعض اکابر کے اسماء درج ذیل ہیں۔

(۱) حافظ الاخبار شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی علیہ الرحمہ اپنے اعتقادات میں تحریر فرماتے ہیں۔

اعتقادنا ان القرآن الذی انزله الله تعالیٰ علی نبیّه محمد صلی الله علیه واله وسلم هو ما بین الدفتین وهو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذلك...... ومن نسب الینا انّا نقول انه اکثر من ذلك فهو کاذب۔

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جس کو خدا نے اپنے نبی محمدؐ پر نازل کیا تھا وہ یہی ہے کہ جو موجود اور لوگوں کے ہاتھ میں متداول ہے اور وہ اس سے زیادہ نہ تھا۔۔۔۔۔اور جو شخص ہماری طرف یہ نسبت دے کہ ہم قرآن کو موجودہ مقدار سے زیادہ کہتے ہیں وہ غلط گو ہے۔''

(۲) سید مرتضیٰ علم الہدیٰ علیہ الرحمہ نے مسائل طرابلسیہ میں تحریف قرآن کا انکار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تحریف قرآن کا قول ایک جماعت کی طرف ناقلین حدیث میں سے منسوب ہے جنھوں نے اخبار ضعیفہ نقل کر کے خیال کیا ہے کہ وہ صحیح ہیں لیکن یہ اخبار ان یقینی وغیر مشکوک وجوہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو ہمارے قول کی صحت کو بتلاتے ہیں۔

(۳) شیخ الطائفہ محمد بن الحسن طوسیؒ اپنی عظیم الشان تفسیر تبیان میں تحریر فرماتے ہیں۔

امّا الکلام فی زیادته و نقصانه یعنی القرآن فممّا لا یلیق به لانّ الزیادة فیه مجمع علی بطلانه والنقصان منه فالظاهر ایضا من مذهب المسلمین خلافه وهو الالیق بالصحیح من مذهبنا کما نصره المرتضی وهو الظاهر من الروایات۔

''قرآن مجید کے متعلق زیادتی و نقصان کی بات کا زبان سے نکالنا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ زیادتی کے تو بطلان پر اجماع ہے اور نقصان کے متعلق بھی عام مسلمانوں کے مذہب کا ظاہر یہی ہے کہ نقصان نہیں ہوا ہے اور ہماری جماعت شیعہ کا بھی صحیح مذہب یہی کہا جا سکتا ہے جس کو سید مرتضیٰؒ نے تقویت دی ہے اور وہ ائمہؑ کے روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔''

(۴) امین الاسلام شیخ ابوعلی طبرسی تفسیر مجمع البیان میں لکھتے ہیں۔

اما الزیادۃ فیه فمجمع علی بطلانه واما النقصان فیه فقد روی جماعة من اصحابنا و قوم من حشویة العامة انّ فی القرآن تغیراً ونقصانا والصحیح من مذهب اصحابنا خلافه وهو الذی نصره المرتضیٰ قدس الله روحه۔

”قرآن میں زیادتی کا ہونا تو باجماع باطل ہے اور کمی کے متعلق کچھ شیعہ وسنی محدثین نے روایات نقل کردیئے ہیں کہ اس قرآن میں کچھ تغییر وتبدیل اور نقصان ہوا ہے لیکن ہمارے علماء میں جو صحیح مذہب ہے وہ اس کے خلاف ہے اور یہی وہ ہے جس کو سید مرتضیٰؒ نے ثابت کیا ہے۔“

(۵) فاضل تونی ملا عبداللہ بشرینی خراسانی شرح صافیہ مطبوعہ لکھنؤ، ص ۵۲، ۵۳ میں لکھتے ہیں قد وقع الخلاف فی تغییره فقیل ان فیه زیادۃ ونقصانا وبه روایات کثیرۃ رواها الکلینی وعلی بن ابراهیم فی تفسیره والمشهور انه محفوظ ومضبوط کما انزل لم یتبدل ولم یتغیر حفظه الحکیم الخبیر۔

”قرآن مجید میں تغیر وتبدیل واقع ہونے کے متعلق اختلاف ہوا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس میں کچھ الفاظ کی کمی زیادتی ہوئی ہے اور اس کے متعلق بہت سی روایتیں بھی وارد ہوئی ہیں جن کو کلینی وعلی بن ابراہیم نے درج کیا ہے لیکن مشہور بین العلماء یہ ہے کہ وہ جتنا نازل ہوا تھا اتنا ہی محفوظ ومضبوط ہے اور اس میں تغیر و تبدیل نہیں ہوئی۔ خدا نے اس کی حفاظت فرمائی ہے۔“

(۶) علامہ محمد حسن آشتیانیؒ بحر الفوائد فی شرح الفرائد مطبوعہ ایران، ص ۹۹، میں لکھتے ہیں:

المشهور بین المجتهدین والاصولیین بل اکثر المحدّثین عدم وقوع التغییر مطلقا بل ادعی غیر واحد الاجماع علی ذلك سیما بالنسبة الی الزیادۃ۔

”قول مشہور مجتہدین اور اصولیین بلکہ اکثر محدثین کے درمیان میں بھی یہی ہے کہ قرآن میں تغیر و تبدیل بالکل نہیں ہوئی ہے بلکہ متعدد حضرات نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے خصوصاً زیادتی کے متعلق۔“

اس کے بعد طرفین کے ادلہ نقل کرنے کے بعد خود محاکمہ فرماتے ہوئے لکھا ہے: الاخبار الدّالة بظاهر ها علی حدوث التغییروان کانت کثیرۃ الا ان اکثرها الّا ما شذّ

ضعیفة السند ویمکن دعویٰ تواترها فلا یقدح ضعف السند فیها لکن الانصاف عدم نصوصیتها فیما ذکره الاخباریون وقوة احتمال ارادة ما عرفته من وجوه المعانی فیها۔

''وہ اخبار جو ظاہری طور پر تغییر کے وقوع کو بتلاتے ہیں وہ بہت ہیں مگر وہ سوائے شاذ و نادر کے اکثر ضیعف السند ہیں۔ ہاں ان کے تواتر کا ادعا کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ضعف سند میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ اخباریین کے قول کو صریحی طور پر بتلاتے بھی نہیں اور احتمال قوی ہے کہ ان سے مراد وہی معانی ہوں جو ان اخبار کی تاویل میں ذکر کئے گئے ہیں۔''

یہ تو وہ عبارات ہیں جو بحالت موجودہ ہمارے پیش نظر ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ مفید علیہ الرحمہ نے کتاب المقالات میں لکھا ہے۔

قد قال جماعة من اهل الامامة انه لم ینقص من کلمة ولا من آیة ولا من سورة۔

''ایک جماعت نے امامیہ میں سے کہا ہے کہ قرآن میں سے کوئی سورہ کوئی آیت بلکہ کوئی کلمہ بھی کم نہیں ہوا ہے۔'' سید محسن اعرجیؒ نے شرح وافیہ میں اور شیخ فتح اللہ کاشانیؒ نے تفسیر منہج الصادقین میں بھی اس خیال پر زور دیا ہے۔

ان حضرات کے خلاف کچھ علماء جن میں اکثر اخباریین اور بعض اصولیّین داخل ہیں مذکورۂ سابق روایات کی بناء پر اس امر کے قائل ہو گئے ہیں کہ قرآن میں کمی واقع ہوئی ہے اور محدث نوری نے تو اس موضوع پر مستقل کتاب لکھ دی ہے جس کا نام ''فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب'' ہے لیکن اس کتاب کو عام طور پر علمائے شیعہ نے نظر قبول سے نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ آقا مہدی موسوی کاظمی اپنی کتاب ''احسن الودیعہ فی تراجم علماء الشیعہ'' مطبوعۂ بغداد، ص ۹۰ میں محدث نوری کے حالات اور ان کے مصنفات کی فہرست لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الارباب طبع فی ایران علی الحجر بقطع امالی شیخنا الطوسی ولیته ما الّفه وقد کتب فی رده بعض العلماء رسالة شریفة بیّن فیها ما هو الحق وشنّع علی المحدث النوری علماء زمانه۔

’’فصل الخطاب در اثبات تحریف کتاب ایران میں امالی شیخ طوسیؒ کی تقطیع پر طبع ہوئی ہے اور کاش انھوں نے یہ کتاب نہ لکھی ہوتی اوراسی زمانہ میں بعض علماء نے اس کی رد میں ایک رسالۂ شریفہ تصنیف کیا تھا جس میں اس مسئلہ میں جو قول حق ہے اس کو واضح کیا تھا اور محدث نوری پر اس کتاب کی وجہ سے ان کے زمانہ کے علماء نے طعن و تشنیع کی۔‘‘

اس صورتِ حال کے بعد فرقہ شیعہ کی طرف متفقہ حیثیت سے یہ نسبت دینا کہ وہ تحریف قرآن کا قائل ہے غلط ہے۔

قائلین تحریف کا ایمان بالقرآن

عام طور پر اس خیال کی نشر واشاعت کی جاتی ہے کہ تحریف قرآن کا عقیدہ ایمان بالقرآن کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اس لئے کہ جس کتاب میں تغیر وتبدیل اور حذف واسقاط عمل میں آگیا ہو وہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہوگئی اور یہ حق باقی نہیں رہا کہ اس پر ایمان کا دعویٰ کیا جائے لیکن یہ خیال حقائق مذہب اور احکام عقل سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

ہم نے ’’معیار حجیت یا سند اعتبار‘‘ کے تحت میں اس امر کی کافی توضیح کردی ہے کہ تحریف کا اجمالی ثبوت جس کے اندر مخصوص موارد اور خاص نوعیت کی تعیین نہ ہو بے شک تمام کتاب کو غیر معتبر بنانے کا سبب ہوسکتا ہے لیکن تحریف کا ثبوت اس طرح کہ اس کے مقامات کی تعیین اور نوعیت کا علم ہوجائے موجودہ حصہ کے اعتبار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا جب کہ موجودہ حصہ کے متعلق قطعی دلائل بھی موجود ہوں جو اس کے حجیت واعتبار کے ضامن ہیں۔

علمائے شیعہ میں سے وہ افراد جو مذکورۂ سابق روایات کے ظاہری مفاد کی بناء پر موجودہ قرآن میں نقصان وتحریف کے قائل ہوگئے ہیں ان کے عقیدۂ تحریف کی نوعیت یہی ہے۔

گذشتہ روایات کو ان تمام اقسام کے ساتھ جنھیں ہم نے ترتیب وار پیش کیا ہے اگر اسی اعتبار سے دیکھا جائے کہ ان میں تحریف قرآن کا اظہار کیا گیا ہے تو ان سے ثبوت تحریف کا اجمال ایک محدود دائرہ کی تفصیل پر منطبق ہوجاتا ہے جس کے بعد قرآن مجید پر عمل اور اس سے احکام شرعیہ کے استفادہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

ایک قسم کے روایات کا یہ مفاد کہ تحریف ہوئی ہے اور دوسری قسم میں اس کی تشریح کہ یہاں یہ نام تھا وہ ساقط ہوا اور وہاں وہ نام تھا وہ حذف ہوگیا اور پھر تیسری قسم میں نوعیت تحریف کا بیان کہ اس سے وہ جو اہلبیت کی خلافت اوران کے معاندین کی مخالفت میں صراحتیں تھیں جاتی رہی ہیں اس سب کا مجموعہ موجودہ اجزائے قرآن اوران سے مستفادشدہ احکام شرعیہ کی حقانیت وصداقت کواس تحریف کی زد سے الگ کردیتا ہے۔

اب ذراانصاف کی آنکھیں کھول کردیکھوکہ تحریف کے متعلق دوقسم کی روایتیں ہیں۔

ایک وہ جواجمالی طور پرقرآن کے اندرتغیر وتحریف کا پتہ دیتی ہیں۔دوسری وہ جوتحریف کے موارد کے معیّن اوراس کی نوعیت کوواضح کردیتی ہیں۔

پہلی قسم کی روایتیں اگرتنہا ہوں توقرآن کے ہر ہر جزو کومشکوک بنا دیتی ہیں لیکن دوسری قسم کے روایات کاضمیمہ بڑے حصہ کوقرآن کے تحریف سے علیحدہ کردیتا ہے۔

پہلے قسم کے روایات سنی وشیعہ دونوں کی کتابوں میں مذکور ہیں اور اہلسنت کے جوامع حدیث میں نمایاں طور پرانہیں جگہ دی گئی ہے جس کی تصدیق کے لئے اگر چاہوتواسی کتاب کے وسطی حصہ کا چندورق الٹ کردوبارہ مطالعہ کرلو۔

لیکن دوسری قسم کے روایات کتب شیعہ سے مخصوص ہیں اوران کا پتہ اہلسنت کے جوامع حدیث میں نہیں ہے اب بتلاؤ کہ قرآن کے سندواعتبار کی حفاظت کس فریق نے کی اورایمان بالقرآن کا دعویٰ کس کو زیادہ زیب ہے۔

درحقیقت شیعوں نے رسولؐ کے بعدایک معصوم کے وجودکوتسلیم کرکے اپنے لئے یقینی طور پرمذہب و تعلیمات مذہب پرکاربند ہونے کااورحقائق ایمان پراعتقادرکھنے کادروازہ کھلا رکھا ہے اورانہی ائمہ معصومین علیہم السلام کے بیانات وہ ہیں جوقرآن مجید کے متعلق ہرتاریک پردہ کو چاک کرکے اپنے برق پرتوہدایات کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔

قرآن مجید کی حجّیت واعتبار کی قطعی دلیل
ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے متفقہ اقوال

علمائے شیعہ وحفاظ ملّت کے مستند کتب احادیث وجوامع اخبار میں ایسے احادیث کابڑاذخیرہ ہے جن

سے موجودہ قرآن مجید کا اعتبار و استناد اور اس کے کلام الٰہی ہونے کا اعتقاد اور اس پر عمل کا واجب و لازم ہونا یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم ان تمام احادیث کو درج کرنا چاہیں تو ہمارا یہ رسالہ ایک مبسوط کتاب کی شکل اختیار کرلے گا جس کے لئے ہمیں وقت وفرصت کی کمی اجازت نہیں دیتی اور پھر جب کہ ہمارا رسالہ موجودہ حالت ہی میں اس مقدار سے آگے بڑھ گیا ہے جس کا ہمارے دل میں قبل سے ارادہ تھا، لہٰذا ہم اس باب کو اسی حد تک کہ جس کی بہت زیادہ ضرورت محسوس ہوگی وسعت دے کر ختم کردیں گے اور ناظرین کو بقیہ نظائر و امثال کے لئے کتب احادیث کے تتبع کی دعوت دیں گے۔

موجودہ قرآن کے متعلق حقیقی جامع قرآن امیرالمومنینؑ کے اقوال

(۱) نہج البلاغہ مطبوعہ مصر، ج ۱ ص ۲۷۰۔

کتاب اللہ بین اظہرکم ناطق لا یعیی لسانہ وبیت لا تھدم ارکانہ وعزّ لا تھزم اعوانہ۔

’’کتاب الٰہی تمہارے اندر موجود ہے، وہ ایسا خطیب ہے جس کی زبان تھکنے والی نہیں اور ایسا قلعہ محکم ہے جس کے ستون منہدم ہونے والے نہیں اور ایسا نقطۂ عزت ہے جس کے طرف دار شکست کھانے والے نہیں۔‘‘

(۲) ص ۳۰۳

علیکم بکتاب اللہ فانہ الحبل المتین والنور المبین والشفآء النافع والرّیٰ النافع والعصمۃ للمتمسک والنجاۃ للمتعلق لا یعوّج فیقام ولا یزیغ فیستعتب ولا تخلقہ کثرۃ الرد وولوج السمع من قال بہ صدق ومن عمل بہ سبق۔

دیکھو کتاب خدا (قرآن) پر عمل کرتے رہو اس لئے کہ یہ (خدا کی) ریسمان محکم اور ضیائے روشن اور امراض نفس کا فائدہ پہونچانے والا درمان اور تشنگان ہدایت کی سیرابی کا سامان اور دامن تھامنے والے کے لئے بہترین محافظ اور وابستہ ہونے والے کے لئے نجات کا ذریعہ ہے وہ کبھی کج ہونے والا نہیں کہ اس کو سیدھا کرنے کی ضرورت ہو اور نہ وہ صحیح راستہ سے مڑنے والا ہے کہ اسے پلٹانے کا موقع پیش آئے۔ بار بار پڑھنا اور کانوں

میں گوش زد ہونا اس کو کہنا نہیں کرتا جو اس کے موافق بات کہے وہ سچا اور جو اس پر عمل کرے وہ کامیاب ہے۔

(۳) ص ۳۴۷ ـ اعلموا انّ هذا القرآن هو الناصح الذی لا یغشّ والهادی الذی لا یضلّ والمحدّث الذی لا یکذب وماجالس هذا القرآن احدٌ الّا قام عنه بزیادة او نقصان زیادة فی هدی او نقصان من عمی واعلموا انّه لیس علی احد بعد القرآن من فاقة ولا لاحد قبل القرآن من غنی فاستشفوه من ادوائکم واستعینوا به علی لاوائکم فان فیه شفآءً من اکبر الدّآء وهو الکفر والنفاق والغیّ والضلال فاسألوا الله به وتوجهوا الیه بحبّه ولا تسالوا به خلقه انه ما توجه العباد الی الله بمثله واعلموا انه شافع و مشفّع وقائل ومصدق وانه من شفع له القرآن یوم القیامة شفّع فیه ومن محل به القرآن یوم القیامة صدق علیه فانه ینادی منادیوم القیامة الا ان کل حارث مبتلی فی حرثه وعاقبة عمله غیر حرثة القرآن فکونوا من حرثته واتباعه واستدلوه علی ربکم واستنصحوه علی انفسکم واتهموا علیه اراء کم واستغشوا فیه اهوائکم۔

یقین جانو کہ یہ قرآن وہ ناصح ہے جو دھوکا نہ دے اور وہ راہنما ہے جو کبھی گمراہ نہ کرے اور وہ بات کرنے والا ہے جو کبھی جھوٹ نہ بولے، کوئی اس قرآن کا ہمدم نہیں بنا۔ مگر یہ کہ اس میں زیادتی پیدا ہوئی یا کمی، زیادتی ہدایت میں اور کمی ضلالت میں اور یقین جانو کہ قرآن کے ساتھ کسی کو احتیاج باقی نہیں رہ سکتی اور قرآن کے بغیر استغناء ناممکن۔ اس کو تم اپنے امراض کے لئے ذریعۂ شفا اور اپنی مصیبت کے وقت پر مددگار قرار دو اس لئے کہ اس میں سب سے بڑے مرض کی شفا موجود ہے جس کا نام ہے کفر اور نفاق اور کور باطنی و گمراہی، خدا سے اس قرآن کے ذریعہ سے سوال کرو اور اسی کی محبت کے ساتھ اس کے بارگاہ کی طرف رخ کرو۔ لیکن اس قرآن کو مخلوق کے پاس رشوت ستانی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ بے شک خدا کی بارگاہ میں اس سے بڑھ کر کوئی وسیلہ نہیں۔ یقین جانو کہ یہ قرآن شفاعت کرنے والا اور اس کی شفاعت قبول کی جانے والی ہے جس کی سفارش روز قیامت قرآن کردے گا۔ اس کے متعلق سفارش منظور ہوگی اور جس کی شکایت روز قیامت قرآن کردے گا۔ تو اس کے خلاف اس کی شکایت مسموع ہوگی۔ روز قیامت آواز دی جائے گی کہ ہر کاشتکار آج اپنی کاشت کے

حساب میں مبتلا ہوگا سوا اس شخص کے جس نے کشت قرآن کو سرسبز کیا ہو۔ پھر کیوں نہ تم سب لوگ کشت قرآن کے کارندے اور اتباع ہو جاؤ اور اس قرآن کو اپنے رب کی جانب اپنا رہنما قرار دو اور اپنے نفسوں کے خلاف اس کی نصیحتوں کو قبول کرو اور اس کے مطالب میں خود اپنے ذاتی خیالات پر بے اعتمادی کرو اور اپنے خواہشات نفس کو خود فریبی سمجھو۔

(۴) ص ۲۸۴

انه سیأتی علیکم من بعدی زمان لیس فیه شئی اخفی من الحق ولا اظهر من الباطل ولا اکثر من الکذب علی الله و رسوله ولیس عند اهل ذلك الزمان سلعة ابور من الکتاب اذا تلی حقّ تلاوته ولا انفق منه اذا حرّف عن مواضعه ولا فی البلاد شئی انکر من المعروف ولا اعرف من المنکر فقد نبذ الکتاب حملته وتنا ساه حفظته فالکتاب یومئذ واهله طریدان منفیّان وصاحبان مصطحبان فی طریق واحدٍ لا یؤویهما مؤو فالکتاب واهله فی ذلك الزمان فی الناس ولیسافیهم ومعهم لان الضلالة لا توافق الهدیٰ وان اجتمعا فاجتمع القوم علی الفرقة وافترقوا من الجماعة کانهم ائمة الکتاب ولیس الکتاب امامهم فلم یبق عندهم منه الا اسمه ولا یعرفون الا خطه وزبره۔

یقیناً میرے بعد ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں کوئی شئے حق سے زیادہ مخفی اور باطل سے زیادہ ظاہر نہ ہوگی، اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی چیز بے قیمت نہ ہوگی جب اس کو حق تلاوت ادا کرتے ہوئے پڑھا جائے یعنی اسکے صحیح معانی کے ساتھ اس کے آیات کو پیش کیا جائے۔

اور اسی قرآن سے زیادہ کوئی شئے رائج نہ ہوگی جبکہ اس کو اس کے مقامات سے ہٹا دیا جائے یعنی اس کے معانی میں تراش خراش کر کے اصلی مقاصد سے دور کر دیا جائے۔ کوئی شے عالم میں معروف سے زیادہ منکر اور منکر سے زیادہ معروف نہ ہوگی قرآن کو اس کے حاملین نے پس پشت ڈال دیا ہوگا اور اس کی حفظ کے دعویدار افراد نے اس کو بھلا دیا ہوگا۔ اس دن قرآن اور حقیقی اہل قرآن شہر بدر اور جلا وطن ہوں گے وہ دونوں ایک دوسرے کے ہم نفس اور ہمدم ہوں گے ان دونوں کو کوئی پناہ دینے والا نہ ملتا ہوگا۔ قرآن اور اہل قرآن

اس وقت لوگوں کے اندر ہوں گے لیکن گویا وہ ان کے اندر اور ان کے ساتھ نہیں ہیں اس لئے کہ ضلالت ہدایت کے موافق نہیں ہوسکتی اگر چہ ایک جگہ پر ہو۔ وہ لوگ افتراق پر مجتمع اور نقطۂ اجتماع سے متفرق ہوں گے ۔گویا وہ خود قرآن کے رہنما ہیں (کہ جدھر چاہیں اس کو پھیر لیں) نہ یہ کہ قرآن ان کا راہنما ہے۔ان کے پاس قرآن کا صرف نام باقی ہوگا اور وہ بس اس کے خط اور حروف کو پہچانتے ہوں گے۔‘‘

اس قسم کے واقعات کا اظہار درحقیقت تحذیر وتخویف کے طور پر کیا جاتا تھا اور غرض یہ تھی کہ لوگ اپنے طرز عمل کی نگرانی کرتے ہوئے اس کو ایسے نتائج تک پہونچنے سے روکتے رہیں۔

اس سے یقینا قرآن مجید پر عمل اور اس کے اتباع کی اہمیت اور اس کے صحیح معانی کے فہم میں تدبر کی ضرورت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس فقرہ سے کہ کتاب واہل کتاب اس وقت لوگوں کے ساتھ ہوں گے مگر نہیں اس لئے کہ حق وضلال ایک ساتھ جمع نہیں ہوتے‘‘۔قرآن مجید کی حقانیت وصداقت پر تیز روشنی پڑتی ہے۔

آخری فقرہ کہ **لا یعرفون الا خطّه وزبره** اس امر کی صریحی دلیل ہے کہ تحریف سے مراد معنوی تراش وخراش ہے ورنہ الفاظ قرآن محفوظ ہوں گے۔

احادیث کی صحت کا معیار قرآن ہے

ایسے احادیث جوامع حدیث میں اس کثرت سے ہیں کہ جس میں تواتر کا ادعا کیا جاسکتا ہے، جن کا مفاد یہ ہے کہ احادیث کی صحت وعدم صحت کا معیار قرآن مجید ہے۔ان میں سے پانچ حدیثیں تو اصول کافی ہی میں مذکور ہیں۔

(۱) علی بن ابراهیم عن ابیه عن النوفلی عن السّکونی عن ابی عبداللهؑ قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم انّ علی کل حق حقیقة و علی کل صواب نورا فما وافق کتاب الله فخذوه وما خالف کتاب الله فدعوه۔

’’امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ حضرت رسولؐ نے ارشاد کیا ہر حق کے لئے حقیقت نما علامات ہیں اور ہر واقعیت کے لئے روشنی ہے تو جو چیز کتاب خدا کے موافق ہو اسکو لے لو اور جو چیز کتاب خدا کے خلاف ہو اس کو ترک کردو۔‘‘

(۲) محمد بن یحیی عن عبدالله بن محمد عن علی بن الحکم عن ابان بن عثمان

عن عبداللہ بن ابی یعفور وقال وحدثنی حسین بن ابی العلا انه حضر ابن ابی یعفور فی هذا المجلس قال سألت ابا عبداللہ علیہ السلام عن اختلاف الحدیث یرویه من نثق به ومن لا نثق به قال اذا ورد علیکم حدیث فوجدتم له شاهدا من کتاب اللہ عزوجل او من قول رسول اللہ والّا فالذی جاء کم اولیٰ به۔

''امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے سامنے مختلف احادیث آتے ہیں۔جن میں سے بعض کے راوی موثق اور بعض کے غیر موثق ہیں اور پھر ان کے مفاد میں اختلاف ہے (ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے) حضرت نے فرمایا جب تمہارے سامنے کوئی حدیث پیش ہو اور اس کا کوئی شاہد کتاب خدا یا سنت رسولؐ سے موجود ہو تو اس پر عمل کرو ورنہ جو شخص اس روایت کو نقل کر رہا ہے وہی اس پر عمل کا زیادہ مستحق ہے۔''

(۳) عدة من اصحابنا عن احمد بن محمد بن خالد عن ابیه عن النضر بن سوید عن یحیی الحلبی عن ایوب بن الحرّ قال سمعت ابا عبداللہ علیہ السلام یقول کل شیئی مردود الی الکتاب والسنة وکل حدیث لا یوافق کتاب اللہ فهو زخرف۔

''امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ ہر شئے کتاب وسنت کی جانب راجع ہونا ضروری ہے اور جو حدیث کتاب خدا کے موافق نہ ہو وہ بناوٹی ہے۔''

(۴) محمد بن یحیی عن احمد بن محمد بن عیسیٰ عن ابن فضال عن علی بن عقبة عن ایوب راشد عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال مالم یوافق من الحدیث القراٰن فهو زخرف۔

''جو حدیث قرآن کے ساتھ مطابقت نہ رکھتی ہو وہ بناوٹی ہے۔''

(۵) محمد بن اسمٰعیل عن الفضل بن شاذان عن ابن ابی عمیر عن هشام بن الحکم وغیره عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال خطب النبیؐ بمنی فقال ایها الناس ماجائکم یوافق کتاب اللہ فانا قلته وما جاء کم یخالف کتاب اللہ فلم اقله۔

''امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ رسالت مآبؐ نے منیٰ میں خطبہ ارشاد کیا اور اس میں فرمایا کہ جو حدیث تمہارے سامنے ایسی پیش ہو کہ وہ کتاب خدا کے ساتھ موافق ہے تو وہ میرا قول ہوگا اور جو حدیث ایسی

آئے کہ وہ کتاب خدا کے مخالف ہے اس کو سمجھنا کہ میں نے نہیں کہا ہے۔''

دوسرے کتب اخبار میں ایسی ہی حدیثیں اس سے زیادہ موجود ہیں اور باوجود اختلاف مفاد کے ان سب کا متفقہ مضمون یہ ہے کہ قرآن احادیث کی جانچ کا معیار ہے، اب اگر یہ قرآن کہ جو مسلمانوں کے ہاتھ میں موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ائمہ معصومین علیہم السلام کے نزدیک مصدق اور تسلیم شدہ نہ ہوتا تو اس کو احادیث کی صحت و عدم صحت کا معیار قرار دینا صحیح نہ تھا۔ ان میں سے وہ احادیث کہ جو جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہیں ان کو بھی چونکہ ائمہ اہلبیت علیہم السلام نے معیار بتلاتے ہوئے نقل کیا ہے اس لئے ان کی تطبیق بھی اسی قرآن پر ہے کہ جو عام ہاتھوں میں موجود ہے۔

قرآن کی مخالفت کفر ہے

محمد بن اسمعیل عن الفضل بن شاذان عن ابن ابی عمیر عن بعض اصحابه قال سمعت ابا عبدالله علیه السلام یقول من خالف کتاب الله وسنة محمد صلی الله علیه وآله وسلّم فقد کفر۔

''امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص کتاب الٰہی اور سنت رسالتمآبؐ کی مخالفت کرے وہ کافر ہے۔''

قرآن نشان ہدایت ہے

(۱) محمد بن یحیی عن احمد بن محمد عن محمد بن احمد بن یحیی عن طلحة بن زید عن ابی عبدالله علیه السلام قال ان هذا القرآن فیه منار الهدیٰ ومصابیح الدجی فلیجل جال بصره ویفتح للضیآء نظره فان التفکر حیوة قلب البصیر کما یمشی المستنیر فی الظلمات بالنور۔

''امام جعفر صادقؑ نے فرمایا یقیناً یہ قرآن اس میں نشان ہیں ہدایت کے اور چراغ ہیں تاریکی ضلالت کے لئے، جس کو منظور ہو وہ اس سے اپنی بصیرت کو جلا دے اور اس کی روشنی کے لئے آنکھ کھول کر دیکھے کیونکہ غور وفکر کرنا انسان بابصیرت کے دل کے لئے سبب زندگی ہے جس طرح چراغ کی روشنی سے انسان تاریکی میں راستہ قطع کر لیتا ہے۔''

(۲) علی بن ابراهیم عن محمد بن عیسیٰ عن یونس عن ابی جمیلة قال قال ابو عبداللہؑ کان فی وصیة امیرالمومنینؑ اصحابه اعلموا انّ القرآن هدی النهار ونور اللیل المظلم علی ما کان من جهد وفاقة۔

’’امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام اپنی وصیت میں اصحاب سے فرمایا کرتے تھے یقین جانو کہ یہ قرآن دن کو راہنما اور شب تاریک کی روشنی ہے جو سخت ترین ضرورت کے موقع پر کارآمد ہے۔‘‘

قرآن جنت کا راہنما اور جہنم سے سَدِّ راہ ہے

حمید بن زیاد عن الحسن بن محمد عن وهیب بن حفص عن ابی بصیر قال سمعت اباعبداللہؑ یقول ان القرآن زاجر وآمر یأمر بالجنة ویزجر عن النار۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ قرآن روکنے والا اور حکم دینے والا ہے، حکم دیتا ہے جنت کی طرف جانے کا اور روکتا ہے آتش جہنم میں جانے سے۔

اس کے علاوہ تلاوت قرآن کے فضائل، حامل قرآن کا درجہ، حفظ قرآن کا ثواب، تعلیم قرآن کی اہمیت، تدبر فی القرآن کا حکم یہ وہ ابواب ہیں جن میں احادیث حد تواتر تک پہونچے ہوئے ہیں اور اصول کافی کا آخری حصہ ان احادیث سے مملو ہے۔

پھر وہ مقامات جہاں ائمہ معصومین علیھم السلام نے احکام شرعیہ کے لئے آیات قرآن سے تمسک کر کے علمائے مذہب کو ظواہر قرآن سے استفادۂ احکام کا سبق دیا ہے مثلاً عبدالاعلیٰ مولیٰ آل سام کے سوال پر کہ اگر انگلی میں زخم ہو اور اس کو کھول نہ سکتا ہو تو کیا کرے حضرت نے جبیرہ کا حکم دیا اور فرمایا کہ هذا وامثاله یعرف من کتاب اللہ تعالیٰ ما جعل علیکم فی الدین من حرج۔

’’یہ اور اس کے ایسے دوسری جو صورتیں ہوں ان کا حکم تو اس آیت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خداوند عالم نے تمہارے لئے دین میں عسر وحرج نہیں قرار دیا ہے۔‘‘

یا زرارہ کے سوال پر کہ کہاں سے ثابت ہوا مسح سر کے بعض حصہ پر ہے حضرت نے فرمایا ’’لمکان البآء فی قوله تعالیٰ وامسحوا برؤسکم‘‘ اس لئے کہ خداوند عالم نے وامسحوا برؤسکم فرمایا ہے

یہ نہیں کہا کہ امسحوا رؤسکم‘‘۔

ان تمام احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ ائمہ اہلبیت علیہم السلام نے موجودہ قرآن کو تسلیم کرلیا تھا اور وہ اس کو کتاب الٰہی اور واجب العمل قرار دیتے تھے۔

اور پھر اواسط زمانۂ بنی عباس میں خصوصاً امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام رضا علیہ السلام کے عہد میں تقیّہ کا شکنجہ ایسا نہ تھا جو ائمۂ معصومینؑ کی زبان کو اظہار حقائق سے بالکل روکے رہتا۔لیکن کسی ایک حدیث سے بھی اس کا پتہ نہیں دیا جاسکتا کہ امامؑ نے کبھی کسی صحابی کو اس قرآن پر عمل کرنے سے اور اس سے احکام کا استفادہ کرنے سے منع کیا ہو یا نماز و غیر نماز میں اس قرآن کے علاوہ کسی قرآن کے تلاوت کی ہدایت کی ہو۔

امام ابوحنیفہ وقتادہ وغیرہ دیگر علمائے وقت کو پوری آزادی کے ساتھ امامؑ نے اپنے رائے پر عمل کرنے اور اپنے اجتہاد کے مطابق فتویٰ دینے سے منع کیا ہے لیکن اس کی وجہ یہی بتلائی گئی کہ تم محکم ومتشابہ ناسخ ومنسوخ تنزیل وتاویل کا علم نہیں رکھتے اور قرآن کے مطالب کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے سینہ بسینہ اس کے معانی ومطالب کو حاصل کیا ہو لیکن کبھی یہ نہیں کہا گیا کہ یہ قرآن محرّف ہے اس لئے اس سے استفادۂ احکام جائز نہیں ہے۔

کیا ان تمام تصریحات اور ادلہ وشواہد کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوسکتا ہے کہ ائمہ شیعہ سے اس قرآن کے متعلق کوئی تصدیق بھی صادر نہیں ہوئی ہے جو اس کے کتاب الٰہی ہونے کی دلیل ہو۔

ائمہ علیہم السلام کے بعد اور زمانۂ غیبت میں فقہائے مذہب اور علمائے ملّت نے بھی ہر زمانہ اور عصر میں اپنے قول وعمل سے موجودہ قرآن کی مذہبی اہمیت کو محفوظ رکھا۔

دیکھو فقہا کی کتابیں خط مصحف کو بغیر طہارت چھونا جائز نہیں، سجدہ والے سوروں کا جنب وغیرہ کے لئے پڑھنا حرام۔عام سور قرآن کی آیتوں کا پڑھنا ان کے لئے مکروہ، کافر کی ملکیت قرآن کے لئے ناجائز۔ اگر وہ خرید لے تو مجبور کرنا اس کو فروخت پر لازم، موجودہ قرآن کے علاوہ کسی جزو کو بحیثیت قرآن نماز میں پڑھنا حرام۔نجاست کا پہونچانا قرآن تک گناہ کبیرہ احادیث میں سے جو قرآن کے بالکل خلاف ہو وہ مسترد۔ تعارض اخبار کے وقت کسی عموم واطلاق قرآن کے موافق ہونا وجہ ترجیح اور احکام شرعیہ کے ادلۂ اربعہ میں سے قرآن کا پہلا درجہ اس کے بعد بھی کیا ان کا ایمان بالقرآن کسی دلیل وبرہان کا محتاج ہے؟

تمام بحث کا آخری نتیجہ

یا

میرا عقیدہ

موجودہ قرآن کلام الٰہی وحی آسمانی۔ رسولؐ کا اعجاز اور مسلمانوں کے لئے واجب العمل ہے۔ اس کے کسی جزو یا کل کے مفاد کی مخالفت مخالفت خدا ہے اور اس کا اتباع ہر مسلمان کا رکن مذہب اور اہم ترین فریضہ ہے۔ موجودہ قرآن کے علاوہ کسی سورہ کسی آیت کسی حرف کا بھی جزو قرآن ہونا ثابت نہیں ہے اور نہ اس پر احکام قرآن مرتب ہو سکتے ہیں۔

واللہ یحق الحقّ بکلماتہ

علی نقی نقوی عفی عنہ

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۱ھ لکھنؤ

❁❁❁